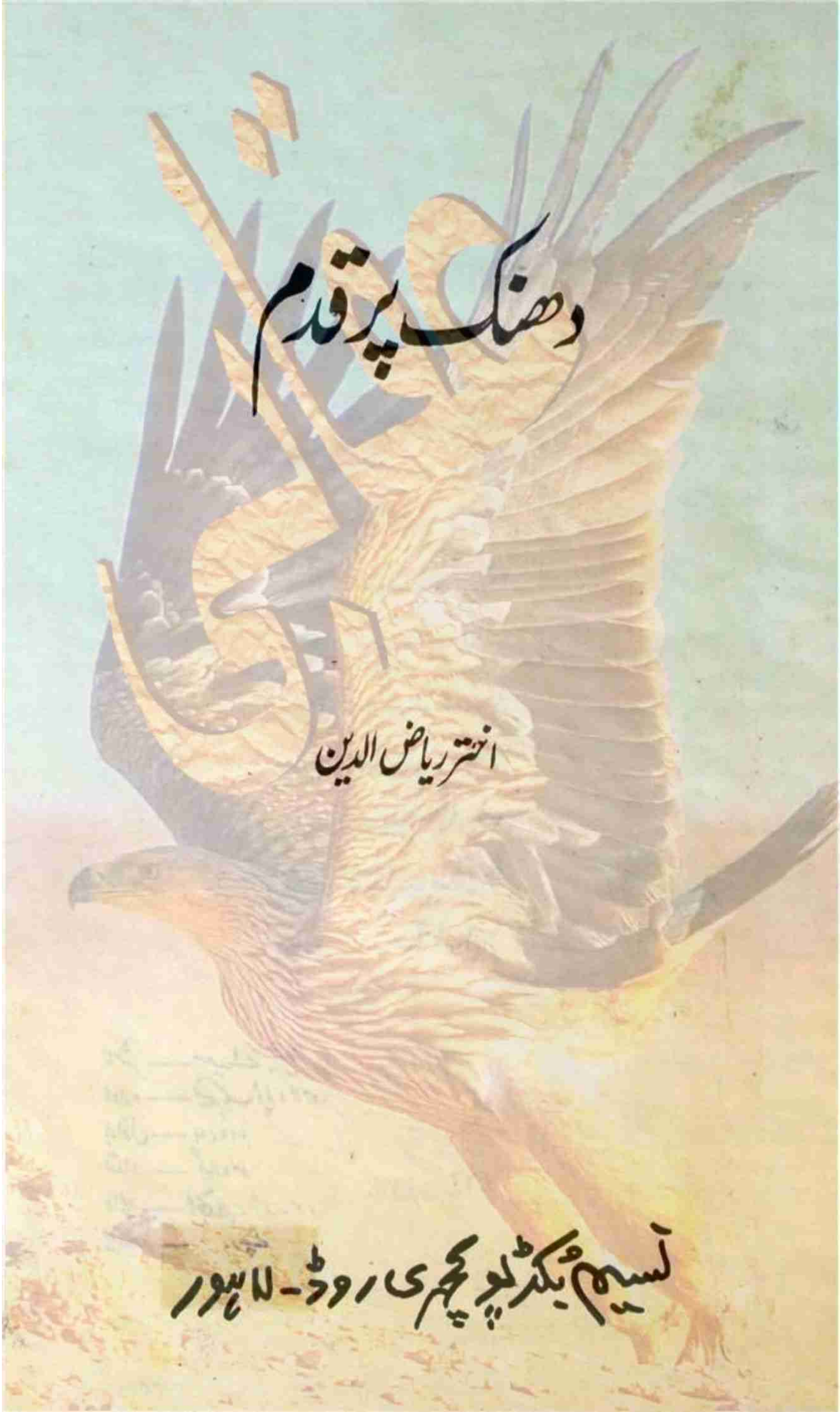
دھنک پر قدم

اختر ریاض الدین

آدم جی انعام یافتہ



دھنک پر قدم

اختر ریاض الدین

نسیم بکڈپو کچہری روڈ۔ لاہور

ناشر ——— سعید اے شیخ
ادارہ ——— نسیم بک ڈپو، لاہور
بار اوّل ——— ۱۹۷۶ء
تعداد ——— گیارہ سو
طابع ——— الجدہ پرنٹرز لاہور
قیمت ——— [illegible]

ترتیب

اعتذار

میری پہلوٹھی کی کتاب "سات سمندر پار" کی پیدائش پر قومی پریس نے (انگریزی اور اردو) جس طرح اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور جس طرح تنقیدی تبصروں میں اس کا ذکر آیا اس سے میں بہت گھبرائی کہ کہیں اہلِ ادب مجھے سنجیدہ طور پر اپنے زمرے میں شامل نہ کرلیں۔ جگہ جگہ سے دعوت نامے آنے شروع ہوگئے۔ کئی رسالوں کے نمائندوں نے انٹرویو کے لیے وقت مانگا۔ میں نے سر کھجایا کہ یارب! میری لاج رکھ لیجو۔ تیرہ سال انگریزی پڑھاتی رہی اور آٹھ سال سے پاکستان ٹائمز کے لیے لکھ رہی ہوں۔ اردو ادب کا ساتھ کبھی کا چھوٹ چکا۔ جب مجھ سے سوال ہوگا کہ اردو میں آپ کا محبوب ناول نگار کون ہے ہائے میں کیا جواب دوں گی۔ شکر ہے جہاں بھی گفتگو ہوئی صرف ذاتی سفر اور تجربوں پر ہی ہوئی۔

حیدرآباد کے ایک وکیل صاحب نے۔ بہت پرخلوص خط میں یہ بھی۔ تجویز پیش کی کہ اس کتاب کا ترجمہ انگریزی میں ہونا چاہیے۔ اور اس کے لیے وہ اپنی خدمات بھی پیش کر رہے تھے۔ میں چاہتی تو انگریزی میں شاید کچھ لکھ ہی لیتی۔ لیکن مولانا صلاح الدین کے اصرار پر میں نے اُردو میں قلم اٹھایا تھا ان کا کہنا تھا کہ اُردو ادب میں سفرناموں کی بہت کمی ہے اور خاص طور سے موسکو پہ جب ریسرچ کی تو پتہ چلا کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے اردو میں چند اوراق ۱۹۲۸ء میں لکھے تھے جو وقت کے ہاتھوں پبلک لائبریری میں پیلے پڑ چکے ہیں۔

ویسے تو میں نے اردو اور فارسی بی اے تک لی تھی مگر پھر بھی انگریزی اس طرح چڑھ گئی تھی کہ مکمل جملہ اپنی مادری زبان میں نہیں اُترتا تھا میرے والد جو ہر فن گھول کر پی چکے ہیں اُردو کے غیر معروف شاعر بھی ہیں۔ وہ اکثر میری کھچڑی اُردو پر صلواتیں سنایا کرتے تھے۔

جب ان کو میری پہلی کتاب کے بارے میں معلوم ہوا تو انہوں نے مجھے بلوا بھیجا اور کہا۔

"صاحبزادی اس ملک میں اُردو چین سے اپنی موت آپ مر رہی ہے۔ تم تو اس کے آخری وقت میں، اس کی مٹی پلید نہ کرو۔" اس طنز کے نتیجہ میں دوسری کتاب حاضر ہے۔ ضد میں انسان کیا کیا حرکتیں نہیں کر بیٹھتا!

بہر حال میری اس ادبی یتیمی کی حالت میں مولانا صلاح الدین احمد کے بعد اگر کسی نے سر پہ ہاتھ

رکھا تو طفیل صاحب نے، بڑے صبر و تحمل کے ساتھ انہوں نے میری جناتی لکھائی کو پڑھا اور اصلاح دی. میری املا ہمیشہ سے مشکوک رہی ہے. خدا کسی دشمن کو بھی ا۔ ع۔ ز۔ د۔ ض کے چکر میں نہ ڈالے

ویسے اب سفر ناموں سے دل بھر گیا ہے. اگر آئندہ اردو میں قلم اٹھایا بھی تو انشا اللہ ڈرامے یا مضامین لکھوں گی. کچھ ادھ کچرے خاکے مدتوں سے بستے ہوئے پڑے ہیں. سفر نامہ اردو میں لکھنے سے محنت دوگنی کرنی پڑتی ہے. بیشتر انگریزی نام اگر صرف اردو میں لکھے جائیں تو سمجھ میں نہیں آتے. اگر بریکٹ میں انگریزی لکھتے جاؤ تو صفحہ اینگلو انڈین لگنے لگتا ہے۔

ہمارے ایک دوست نے رجو اتفاق سے سی ایس پی ہیں "دھنک پر قدم" کا مسودہ پڑھ کر مجھ پر دو الزام لگائے

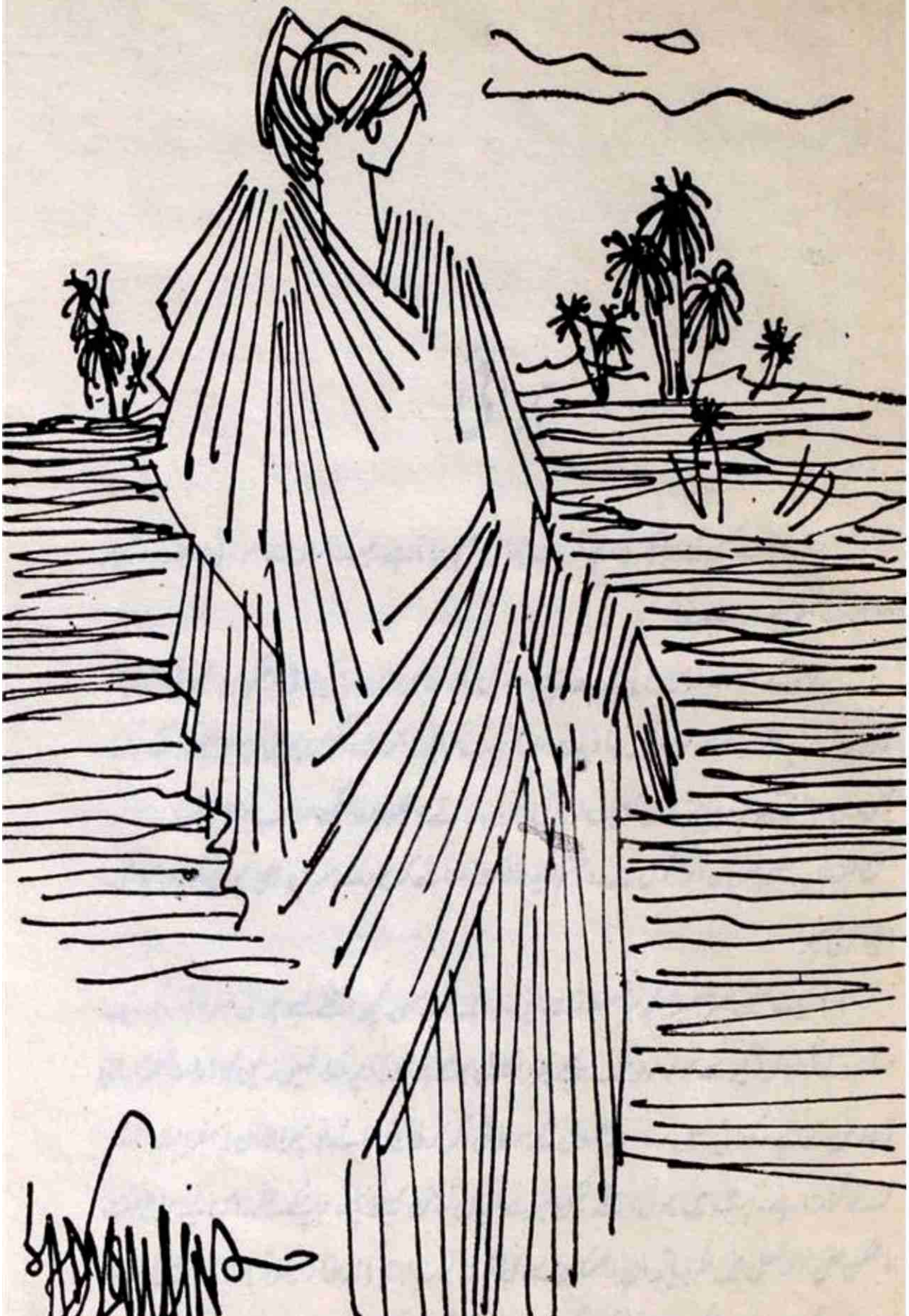
الزام نمبر ۱ کہ میں نے اپنے میاں کو اس کتاب کا ہیرو بنا دیا ہے۔

الزام نمبر ۲ کہ میں نے ساری "سی ایس پی برادری کا مضحکہ اڑا کر اس کی وہ متبرک ناک نیچی کر دی ہے جو پبلک میں ہمیشہ اونچی رہتی ہے

جواب نمبر ۱: میں اپنے میاں کو چھیڑے بغیر رہ نہیں سکتی. یہ میرا موروثی حق ہے. سو سالیاں ایک طرف اور میں اکیلی ایک طرف رہ یہ اور بات ہے کہ حادثاتِ زمانہ نے مجھے ان کی بیوی بنا دیا) میں جس دن ان کو نہ چھیڑ دوں ان کا کھانا ہضم نہیں ہوتا. مجھ سے پوچھتے ہیں "دشمنوں کے مزاج بخیر تو ہیں"؟ اسی قسم کی توجہ کے مرکز وہ اس کتاب میں بھی ہیں. چاہے اسے ہیرو سمجھئے چاہے "ولین"۔

جواب نمبر ۲: "سی ایس پی" برادری چہ معنی دارد ہر سطح پر کنبہ پروری نے اس ملک کی لٹیا ڈبو دی ہے. کوئی بھی سروس ہو خواہ پولیس، خواہ ریلوے، خواہ ہوابازی، ہر فرد اپنا ضمیر، اپنا دماغ رکھتا ہے۔ سروس کوئی ٹریڈ یونین تو نہیں. اس کے علاوہ ایک سی ایس پی کو چورن کی چٹکیاں کھلانی قومی معدے کے لیے مفید ہی ہوں گی. کیونکہ اس کے انداز بعض اوقات بہت ثقیل ہو جاتے ہیں. شاید اس قسم کے زود ہضم طنز سے وہ یہ گر پالے کہ کائنات کا محور وہ نہیں ہے۔

اختر ریاض الدین



ہوائی

ہوائی

یہاں پر جب کسی کی ہوا بگڑتی ہے تو اسے ہوائی بھیجا جاتا ہے۔ میرے میاں سے صوبائی سرکار روٹھی تو یہ دلچسپ سفر بطور سزا عاید ہوا۔

ہوائی کے نام سے ذہن میں پکے پکے پپیتے اور کچی کچی گھاس میں لہراتی ہوئی لڑکیاں ابھرتی تھیں۔ گمان ہوا کہ امریکہ نے سیاحت کو سائنس بنا دیا ہے اور پرچار کو ایک آرٹ۔ کہیں ہوائی کی تعریفوں کے پُل بھی اسی مبالغہ آمیز پروپیگنڈے کی کڑیاں نہ ہوں۔ کون جانے؟ چھوڑو!! لیکن صاحب ستنام محمود اور مسیح الزماں جیسے مہربان دوستوں نے وہ چشم دید حالات سنائے کہ ہمارے سر میں بھی ہوائی کی ہوا سما گئی۔

اچھا بھئی چلو

دنیا کے حسین سفر ہمیشہ مجھ پر مسلط رہے ہیں۔ یہ ایک اور سہی۔ کچھ اتنے لمبے ہوائی سفر کا ڈر۔ کچھ ایک صاحبہ نے ڈرایا کہ ٹوکیو سے ہونولولو تک نیچے بحرالکاہل ہوتا ہے اور اوپر خدا۔ کہیں زمین کا ذرا سا ٹکڑا بھی ڈھارس کے لیے دکھائی نہیں دیتا اور معمول کے مطابق اگر طوفان آ جائے تو پھر الامان! سفر اللہ اللہ کرتے گزرتا ہے۔ پیٹ میں ہول اٹھے لیکن میرے میاں تو تین مہینے پہلے جا چکے تھے۔ اس لیے مراجعت ناممکن تھی۔ اوکھلی میں سر دیا تو ان دھمکوں سے کیا ڈرنا۔ بوریا بسترا باندھا دبستر تو ہوتا ہی نہیں۔ یہ محاورے کی بات ہے، گھر سمیٹ کر ایک گیراج میں بند کیا۔ گھر سمیٹنے میں میں اب طاق ہو گئی ہوں۔ اس طرح پل بھر میں اس کی گٹھڑی باندھ کر الگ کرتی ہوں کہ گویا کبھی تھا ہی نہیں۔ سب سے چھوٹی بیٹی جواب؟ کالج کے پہلے سال میں تھی، ساتھ ہو لی۔ بڑی دو لڑکیوں کے بی اے کے امتحان تھے۔ ان کو

ڈھائی مہینے بعد آنا تھا۔ کراچی پہنچ کر بی، او، اے، سی (BOAC) کا ٹکٹ بک کرایا۔ اس غریب لائن سے اگر جانا ہو تو ۴۸ گھنٹے کی گنجائش رکھنی چاہیئے۔ اگر ۲۶ کو جانا ہو تو ۲۵ کی سیٹ بک کرائو۔ کیونکہ وہ چودہ سو چالیس منٹ سے کم لیٹ ہونا کسرِ شان سمجھتی ہے۔ لیکن میں پھر بھی ہمیشہ اسی ہوائی کمپنی کو چنتی ہوں۔ کیونکہ اس کی نشست آرام دہ ہوتی ہے اور عملہ تمیزدار، تو خیر ہم نے پہلی ٹھیکی کلکتہ میں لگائی۔ کلکتہ میری جائے پیدائش ہے۔ حالانکہ میں صرف ایک سال کی شیرخوار وہاں سے لے آئی گئی تھی۔ لیکن پھر بھی اس جگہ سے انس تھا۔ اس کو دیکھنے کا ارمان تھا۔ لیکن میرے جذبات نے مجھے ہمیشہ دھکے کھلوائے۔ ایرپورٹ سے لے کر پولیس سٹیشن تک جو میرا اور باقی مجھ جیسے سیاحوں کا حال ہوا وہ ناگفتہ بہ ہے۔ خدا کسی شریف انسان کو کلکتہ نہ لے جائے۔ اگر مرزا غالب نے اس میں کچھ دیکھا تو ہندوستانی کسٹم آفیسر اور بنیا پولیس سے پہلے دیکھا ہوگا۔ قصّہ کوتاہ ہم نے جلدی سے اپنی جان چھڑائی اور ہونگ کونگ روانہ ہوئے۔ وہاں جاکر روح خوش ہو جاتی ہے۔ تازہ دم ہو کر ٹوکیو روانہ ہوئے راستہ سخت طوفانی تھا۔ کمبخت "پین ایم" PAN AM پرانا کھٹارا جہاز چار گھنٹے لرزتا رہا اور ہمیں لرزاتا رہا۔ ڈر کے مارے آیۃ الکرسی بھول گئی۔ صرف "کرسی کرسی" زبان پر آ رہا تھا۔ ساتھ بیٹھا جاپانی تاجر تسلی دیتے ہوئے بولا۔ یہ تو کچھ بھی نہیں جب ٹوکیو سے ہوائی جاؤگی تو ہوائی جہاز ایسے اُچھلے گا جیسے "چھاج" میں گیہوں۔ ہم نے اناللہ پڑھ لیا اور ارادہ کر لیا کہ میاں کو ہوائی میں ہی رہنے دیں اور ہم ٹوکیو میں ان کی واپسی کا انتظار کریں۔ لیکن جاپان چھاننے کا شوق خوف پر غالب آگیا اور جنرل شیخ اور بیگم شیخ کی خاطر مدارت کا مزہ چکھ کر، دو دن ٹوکیو ٹھہر کر جل تو جلال تو کہتے ہوئے جاپان ائیرلائنز میں بیٹھ گئے۔ ہوائی جہاز چلا تو ہم نے اللہ سے گڑگڑا کر دعا مانگی کہ یارب ہماری عزت رکھ لے اور خیر سے سفر پورا کر دے۔

میرے مولا نے میری مراد ایسی پوری کی کہ سارا سفر آسمانوں میں ریشم کی طرح سرسر کرتا گزر گیا۔ میں نے اتنے خوشگوار چھ گھنٹے کبھی نہیں گزارے۔ مرد جاپانی ائیرہوسٹس کو گھور گھور کر کھائے جا رہے تھے اور میں بحرالکاہل کی گہرائیاں پی رہی تھی۔ رات کو ساڑھے دس بجے ہمارا جہاز ہوائی کے دارالسلطنت "ہونالولو" میں اترا۔ میاں کو تار دے دیا تھا۔ امید تھی کہ ہوائی اڈے پر ہار لے کر پہنچیں گے۔ جزیرہ

ہوائی کی یہ ایک رسم دیرینہ ہے کہ ہر آنے والے کا پھولوں کے حسین گجروں سے استقبال کیا جاتا ہے۔ لڑکیاں ہار لے کر کھڑی ہوتی ہیں اور اترتے ہوئے سیاحوں کے گال پر مادرانہ (؟) بوسہ دے کر ہار ڈالتی ہیں۔ لیکن یہ سب تکلف مردوں کے لیے ہے۔ میری ذات کو کوئی نہیں پوچھتا۔ اس لیے ارمان تھا کم از کم میاں تو پھول نچھاور کرنے پہنچ جائیں گے۔ لیکن میاں ریاض الدین صاحب حسب معمول غائب۔ رات کا وقت۔ مجھے ان کا پتا بھی نہیں معلوم۔ جناب بلی کی طرح تین گھر تبدیل کر چکے تھے۔ ہوائی کی یونیورسٹی میں فون کیا تو انہوں نے کہا۔ ایسٹ ویسٹ سنٹر (EAST WEST CENTRE) سے پوچھو۔ اتنے میں ایک ٹیکسی والا آگے بڑھا "میں وہاں تک آپ کو لے جاتا ہوں۔ باقی پھر دیکھا جائے گا"۔ "ہائی رائز ہوسٹل" تک پہنچے تو اونچی اونچی عمارات بتیاں جل رہی ہیں طلبا پڑھ رہے ہیں لیکن ہمارے میاں ندارد۔ غصہ اور پریشانی دونوں مل گئے۔ یہ اچھا استقبال ہو رہا ہے! رات کے بارہ بجے! تین مہینے بعد بیوی آئی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اتنے میں ایک کار لڑکیوں سے لدی پھندی چیختی چلاتی آن کر رکی۔ انجان شکلوں نے میرے گلے میں ہار ڈالے۔ پیچھے ایک اور کار اس میں گٹار پر کچھ نوجوان ہوائی کے گیت گاتے ہوئے اترے اور ان نوجوانوں میں چھپے ہوئے میاں ریاض الدین مسکراتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں حسب معمول برستی۔ ان کی سہیلیوں نے سمجھایا کہ تار پڑھنے میں غلط فہمی ہو گئی۔ ہوائی کا وقت پاکستان کے وقت سے ۱۱ گھنٹے پیچھے ہے اس لیے اکثر تاریخوں میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ ہم نے جل کر کہا کہ اصل گڑبڑ تو ہماری شادی کی تاریخ سے شروع ہوئی تھی۔ بہرحال خدا کا شکر ادا کیا۔ ٹیکسی والے کا شکریہ ادا کیا۔ پھر گھر روانہ ہوئے۔ رات کے اندھیرے میں بھی وائی کیکی (WAIKIKI) کا ساحل کبھی نہیں سوتا۔ سڑکیں روشن اور جواں دل روشن تر۔ رات کو ایک بجے میرے لیے میاں کی سہیلیاں گرم مرغی کا روسٹ لائیں اور دودھ چاکلیٹ بنایا۔ مجھے گھر دیکھنے کا شوق لیکن ریاض صاحب ٹالتے جائیں کہ تم صبح آرام سے دیکھنا۔ ابھی کمرے میں بتی مت جلاؤ اور اس کی وجہ سمجھ میں آئی جب گھر کے ہر کونے میں منوں کوڑا اور گرد و غبار دیکھا ہر دراز سے میلے موزے اور رومال، ہر جیب سے تھیٹر، سینما فلور شو کی پرچیاں اور ریزگاری۔ پنڑی

میں پانچ دن سے برتن بغیر دھلے پڑے تھے۔ میاں بجائے برتن دھونے کے نئے برتن نکال نکال کر استعمال کرتے جاتے تھے۔ اس طرح درجنوں موزے، رومال، بنیان خرید ڈالے تاکہ پرانے دھونے نہ پڑیں۔ بہر حال رات کو دو بجے تک اودھم مچتا رہا۔ پھر ہمسائے کی گرجدار آواز آئی "خاموش" ہم عموماً ہمسائے کی بات نہیں سنتے۔ لیکن یہ ہمسایہ ہوائی کا مشہور پہلوان اور "ہیوی ویٹ چمپئن" تھا اور نام بھی تھا (HARD BOILED—HAGGERTY) اس لیے اس کی ایک تنبیہہ ہی کافی تھی۔ دو منٹ کے اندر سب لڑکے لڑکیاں غائب۔ خیر ہم تھکے ہارے سو گئے۔ واللہ اعلم کب اٹھے میاں دفتر جا چکے تھے۔ ناشتہ خود بنایا زندگی میں پہلی دفعہ خود کھانا پکانا تھا پہلی دفعہ جب لندن امپیریل ڈیفنس کورس پر لندن گئے تھے تو اپنا خانساماں ساتھ لے گئے تھے۔ اس لیے کام کا پتا ہی نہ چلا۔ اب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوا۔ میری بیٹی ناز اور میں نے کمر کس کر سارا دن گھر کی صفائی کی۔ اور لنچ قریبی ہوٹل میں جا کر کھایا۔ رات کو بھی کچھ نہیں پکایا۔ جالے، چیونٹیاں اور گرد ہٹا ہٹا کر کمر دکھ رہی تھی۔ یہ جو میاں کی سات پشتوں پر احسان کیا تھا۔ شام کو ہم جزیرے کا اولیں معائنہ کرنے کار میں گئے۔ ڈھلتے سورج میں بحرِ الکاہل کو دیکھیں بدل رہا تھا اور چاروں طرف زمرد کی اہمیت مستحکم ہو چکی تھی۔ تا حدِ نظر سبزہ ہی سبزہ۔ یوں احساس ہوا کہ جزیرے "اوواہو" میں کہنہ مشق کائنات نئے سرے سے شباب پر آئی ہے۔ اس کے ننھے منے رقبے میں فطرت کا ہر رنگ ہر انگ پایا جاتا ہے۔ سمندر یہاں عمیق تر ہوتا چلا گیا ہے۔ یہ جنوبی یورپ کے آبی کناروں (RIVIERA) سے زیادہ نیلا اور چمکیلا ہے۔ دوپہر کے وقت اس نیلم کی بھڑک آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ میں نے وجدانی حسن میں اس طرح ڈوبے ہوئے ساحل بہت کم دیکھے ہیں۔ ان کی ٹھنڈی عنبریں ریتیں گیلے بدن پر یوں پھسلتی تھیں جیسے ٹیلکم پاؤڈر۔

یہاں کے کوہساروں نے اس جزیرے کے گول چہرے کو ایک نیا زاویہ بخشا ہے۔ یہ کہیں سنگلاخ ہیں اور کہیں اتنے سبز کہ ازلی برساتوں کا رین بسیرا معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی کنواری گھاس پر انسان اپنا سایہ ڈالتے جھجکتا ہے۔

اگلے دن ہم سب نے "ہنومابے" پر پک نک منائی۔ یہ جگہ مجھے ایسی بھائی کہ دوڑی چھوٹی ادھر

ہی کا رخ کرتی تھی۔ یہاں پانی سب سے مہذب اور شفاف تھا اور مجھ جیسی ڈرپوک تیراک بھی گھنٹوں "سرف بورڈ" پر لیٹ کر "فلوٹ" کرتی تھی۔ یہ ساحل آبی مخلوق کے لیے مشہور تھا اور ہر قسم کے حلیوں میں "سنوکلرز" (SNORKLERS) ماسک چڑھا زیر آب تحقیق کرتے رہتے تھے۔ ہوائی کی یونیورسٹی دنیا بھر میں علومِ سمندر (OCEANOGRAPHY) میں سبقت لے گئی ہے۔

غرضیکہ اوّل تو قدرت نے اپنے حسن کے لنگر یاں جاری کر دیئے تھے جو کچھ کمی تھی وہ انسان نے پوری کر دی۔ ہوائی بھی خداوند عظیم اور اس کے نائب انسان کی مشترکہ سازش کا ایک جاذب نظر نمونہ ہے۔

اس شام ہم گھر کا سارا سودا لینے "سوپر مارکیٹ" (SUPER MARKET) گئے۔ بہت سے صاحبان اس ادارے کو جانتے ہیں۔ لیکن بہت سی میری ہموطن بہنیں اس کے متعلق جاننا چاہیں گی۔ تو سنیئے سوپر مارکیٹ امریکن سرمایہ داری کا مکمل مظاہرہ اور امریکن طرزِ حیات کا بنیادی قلعہ اور اس کی لامحدود افراط کا ذخار ہے۔ جب سے یہ بردے زمین پر سر بیکار رہوا۔ ننھی ننھی دکانیں اور چھوٹے چھوٹے بساطی پنساری دیوالیہ ہو گئے۔ یہ سوپر مارکیٹ دس بازاروں کا مہاگرو ہے۔ ساری انار کلی اور مال روڈ کی دکانوں کا سامان اس کی ایک لپیٹ میں سما جائے۔ آپ جب داخل ہوں تو فوراً چار پہیوں والی ٹرالی ساتھ لے لیں کہ ہفتے دو ہفتے کا راشن اس میں ڈالتی جائیں اور جب خود چلتے چلتے تھک جائیں تو اس میں بیٹھ جائیں اور کسی اور سے کہیں کہ آپ کو کھینچے۔ صرف یہ آخری نصیحت میری اختراع ہے ورنہ درحقیقت سوپر مارکیٹ ایسی شیطان کی آنت ہے کہ دل چاہتا ہے کہ خود ٹرالی میں لٹک جائیں اس ادارے کی افراط دیکھ کر انسان ایشیا، افریقہ کی بھوک اور قحط بھول جاتا ہے۔ اس جگہ بلاارادہ اور بلاضرورت خریداری کرنی پڑتی ہے۔ ہر شے کی پچاس قسمیں اور ہر قسم چھت تک چنی ہوئی۔ ہر دوسرے قدم پر (SALE) لکھا ہوا۔ غریب گھر گرہستن کو دسکھوں کی طرح) اگر گوس بری جیم نہیں بھی چاہیئے تو وہ بھی پانچ بوتلیں خرید لیتی ہے کیونکہ سستی بک رہی ہے۔ اس کو انگریزی میں COMPULSIVE BUYING صحیح کہا گیا ہے۔ اگر نقد نہیں تو ادھار لیجئے۔ لیکن لیجئے ضرور پھر لاٹری کی لالچ، "ڈسکاؤنٹ کی لالچ"، جو بھی ہو سوپر مارکیٹ میں جا کر عورت کی آنکھیں اور

بٹوے کما جاتے ہیں۔ میں نے پہلے ہی ہفتے میں ۴۲ ڈالر کی کھانے پینے کی چیزیں لے لیں کار بھر گئی۔ اس سوپر مارکیٹ میں الگ نرسری بھی ہوتی ہے جہاں عورتیں اپنے بچے چھوڑ کر اطمینان سے شاپنگ کرتی ہیں۔ لیکن ایک عورت نے اپنے ڈیڑھ سالہ بچے کی گردن میں کتے جیسا پٹہ ڈالا ہوا تھا اور اس کی زنجیر ٹرالی سے باندھی ہوئی تھی۔ وہ سرخ گول مٹول بچہ ماں کے پیچھے پیچھے زنجیر سے بندھا ہوا لڑھکتا چلا آ رہا تھا جیسے کوئی پالتو پلّا ہو۔

میاں نے ہمارے پیچھے کچھ گھر کا سامان خرید رکھا تھا مثلاً

سیکنڈ ہینڈ کار	ایک عدد	جو دستی ہینڈل سے چلتی تھی
ٹیلی وژن	"	جو دھموکوں سے بولتا تھا
صوفہ	"	جس میں سے کھٹّی کھٹّی بھبھک اُٹھتی تھی
گراموفون	"	جس پر ہر مردانی آواز "پیارے صاحب" کی نسوانی مرکیوں کی طرح پھسلتی تھی۔
ٹیپ ریکارڈر	"	جس پر صرف تین گانے بھرے جا سکتے تھے
باغ کی ہلکی کرسیاں	چار عدد	صرف یہ ابھی تک ساتھ دے رہی تھیں۔

اتنا سلیقہ میرے میاں میں کہاں سے آگیا۔ مجھے نہیں معلوم۔ لیکن یہ سب ایک دکان کے توسّل سے ہوا، جو غریب، مفلوجوں اور یتیموں کے لیے چلائی گئی تھی۔ اس لیے میرے میاں نے خیرات کے جذبے میں اپنے گھر کو پھٹیچر فرنیچر سے بھر لیا۔ کار ۱۹۵۷ء کا ماڈل تھی۔ جب چلتی تو دنیا دیکھتی تھی اور جب رُکتی تھی تو دنیا شکر کرتی تھی اس کے پُراسرار پتا نہ معلوم کہاں سے چھوٹتے تھے۔ ہم نے جاتے ہی کام بانٹ لیے۔ میں کھانا پکاؤں گی۔ بیٹی صفائی کرے گی۔ میاں بولے ہم تمہاری ڈرائیوری کریں گے۔ ہم لاجواب ہو گئے اس لیے کوئی اور کام ان کو نہ دیا کیونکہ اس کار کو چلانا ان ہی کا کام تھا۔ میں باہر ملک میں اگر کار چلاؤں تو کم سے کم مانوس ڈھانچہ تو ہو۔ اس کم بخت کے گیئر کدھر اور بریک کدھر۔ بالکل بے سر دپا۔ لیکن شاباش ہے اس کار پر کہ ہزاروں میل سیریں کیں لیکن اس نے ایک دفعہ بھی دغا نہ دی۔ پرانا ٹیلی وژن کچھ ایسا بُرا نہ تھا۔ دو دھپ لگاؤ یا گرم کمبل ڈالو تو اس کے کالے

سفید ترمرے ناپنے بند ہو جاتے تھے پھر گھنٹوں صحیح چلتا تھا۔ جب تک کہ مپنیل نہ بدلو۔ چینل بدلی اور اور پھر وہی دھمو کے تھپیڑ۔ گرم پانی کی بوتل، وہ پھر چل پڑا۔

تو صاحب یہ تو ہوائی کا ازدواجی رُخ تھا۔ اب تک گرہستن ماں بیوی بول رہی تھی۔ لیکن یہ گرہستن ماں بیوی دو وقت بلکہ اگلے دو دن کا اکٹھا کھانا پکا کر ریفریجریٹر میں بھر کر آزادی کا سانس بھی لیتی تھی۔ جگہ جگہ سیر پہ خود نکل جاتی تھی۔ لائبریریوں سے گود بھر بھر کر جزائرِ ہوائی بلکہ سارے بحرالکاہل کے جزائر پر کتابیں لاتی تھی۔ آہستہ آہستہ لوگوں سے ملاقات، پروفیسر صاحبان سے گفتگو، سیّاحوں اور طلبا سے میل جول، بہت اچھا وقت گزرا۔ ہونولولو کے مختلف مدارج ابھرنے شروع ہوئے اس کی ہمہ گوں زندگی کی چاشنی کا چسکہ لگ گیا۔

ہوائی کی قدرتی ساخت اور تاریخ انسانی پر نظر بعد میں ڈالوں گی۔ پہلے میاں ریاض الدین کی شان نزدل بتاؤں۔ ہوائی میں امریکہ کی فیڈرل حکومت نے ایک عظیم الشان مرکز کھولا ہے۔ جسے "ایسٹ ویسٹ سنٹر" EAST WEST CENTRE کہتے ہیں۔ اس کی حسین حدود اور عمارات میں مغرب اور مشرق کے عالم مدعو کئے جاتے ہیں جو "سینئر سکالر" SENIOR SCHOLAR کہلاتے ہیں۔ وہ مرکز کے خرچ پر آتے ہیں۔ ہزار بارہ سو ڈالر کا وظیفہ ہر مہینے پاتے ہیں (اس ننھے سے وظیفے میں ایک خاندان ٹھاٹ کر سکتا ہے۔ دس مہینے یا سال کورس کی میعاد ہوتی ہے۔ اس دوران میں جو مرضی آئے کیجئے۔ پڑھئے لکھئے، ریسرچ کیجئے۔ تاثرات قلمبند کیجئے۔ کوئی پابندی نہیں، کوئی امتحان نہیں، کوئی کلاس نہیں۔ کوئی وقت نہیں۔ میرے میاں اس آزادی پر مگن تھے۔ آپ کا آرام دہ کمرہ، ٹائپ رائٹر، غسل خانہ، بہترین لائبریری، ساتھ ہی سستا اور مزے کا ریستوران، اردگرد لڑکے لڑکیاں، آزادی کی فضاء اکثر عالم سگریٹ کا دھواں اور غپ اڑاتے پائے جاتے تھے۔ لیکن کوئی رپورٹ کرنے والا نہیں تھا۔ کچھ عالم کتابیں بھی لکھ جاتے ہیں جو یہ مرکز بہت فخریہ شائع کرتا ہے۔

اب ایک سی ایس پی کے لیے "سینئر سکالر" بننا بہت آسان ہے۔ سینئر تو وہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے۔ اسے کبھی بچپن میں بھی غلطی سے کسی نے جونیئر نہیں کہا۔ اب رہا "سکالر"

توسی ایس پی کا بلّا لگتے ہی وہ عالم بھی بن جاتا ہے۔ ضلع میں ہر کتاب پراسی کا پیش لفظ ہوتا ہے۔ کالج کے "کانووکیشن" پر وہ عالمانہ تقریر جھاڑتا ہے۔ اس کے فتوے پر نکاح ٹوٹتے ہیں اور بی۔ ڈی جُڑتے ہیں۔ آرٹ کونسل، اسلامی مشاورتی کونسل، فلسفہ والسنہ کی مجلسوں۔ سائنس کے ایوانوں کا چیئرمین اسی کرسی کا بندہ ہوتا ہے۔ اس لیے ایک سی ایس پی کے لیے ہوائی میں "سینئر سکالر" کہلانا کوئی معیوب یا مضحکہ خیز بات نہیں۔ اس میں جو بھی ہو۔ طنز ہرگز شامل نہیں۔ خیر میاں ریاض الدین نے اس عالمانہ ماحول میں اس طرح غوطہ لگایا جیسے مچھلی اپنے مالوس پانی میں (لیکن اس مچھلی کو کبھی کبھی اپنی "فائلات فائلا" اور پی اے ضرور یاد آتا تھا)

ہاں تو ایسٹ ویسٹ سنٹر اور ہوائی کی یونیورسٹی میں یوں تو ارضی قربت ہے لیکن ازلی رقابت بھی ہے۔ کسی حد تک یہ رقابت صحت مند بھی ہے۔ امریکہ کے بہترین پروفیسر اور اعلیٰ ذہن سردی گرمی لیکچر کے لیے بلائے جاتے ہیں۔ طرح طرح کی نمائشیں فلم، جشن منائے جاتے ہیں۔ اس کی جدید عمارات کے سامنے لمبی سے لمبی موٹریں جو آدھی طلبا کی اور آدھی پروفیسروں کی ہوتی ہیں۔ امریکہ کی افراط کا صحیح ثبوت ہیں۔

اس مغرب و مشرق کے مرکز کا ایک جاپانی باغ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ اتنا "ایمان شکن" ہے کہ میں اکثر لائبریری جاتے جاتے اس میں گھس جاتی تھی۔ جزائر "ٹھیٹی" کے پھول خصوصاً "گارڈینیا" زرد چنبیلی، کنول، کچا کچا سبزہ، نڈھال پانی اور رنگین مچھلیاں اور اس کی پشت پر ممنوع درختوں کا ذخیرہ۔

اس "ایسٹ ویسٹ سنٹر" کے علاوہ یونیورسٹی کا میلوں میں پھیلا ہوا احاطہ بھی ایک دیدہ زیب سبزہ زار ہے۔ ہر قدم پر گل آویزاں روشیں اور بتدریج باڑیں۔

لیکن اس کے علاوہ جو سب سے دل پذیر عنصر اس فضا میں پایا جاتا تھا وہ تھا بین الاقوامی طلبا کا ربط ضبط۔ جنوبی بحرالکاہل سے لے کر جاپان، انڈونیشیا، برما، ملایا، فلپائن، کوریا، ویتنام فی جی کے جزائر، آسٹریلیا، پاکستان، ہندوستان، یورپ اور امریکہ کے جواں سال جویندگانِ علم

یہ معاشرتی تنوع بھی ایک تعلیمی حیثیت رکھتا تھا۔ یہاں بھانت بھانت کے لڑکے لڑکیوں سے ملنا جلنا۔ تبادلہ خیالات کرنا۔ طرح طرح کے کھانے طرح طرح کے گانے۔ طرح طرح کے رقص ہنستے کھیلتے انسان بے شمار نئی باتیں سیکھ لیتے تھے۔

پہلے ہفتے ہی ایسٹ ویسٹ سنٹر نے اپنی مشہور تعارفی رات منائی۔ یہ جشن کی طرح منائی جاتی ہے اور ہوائی زبان میں اسے "لوآؤ" LUAU کہتے ہیں۔ سارا مرکز پھولوں سے سجا ہوا تھا مختلف پھلوں کے رس سے بنائی ہوئی "پنچ" کے جام چل رہے تھے۔ ہلکی ہلکی مشعلیں، رنگین قمقمے اور موم بتیاں جل رہی تھیں۔ جاپانی باغ میں دُور دُور آراستہ میزیں۔ میزبانوں اور مہمانوں سے تعارف کراتے کراتے ہمیں اپنی نشست پر لایا گیا۔ طعام شروع ہوا۔ مدھم سروں میں "اوک بیلی" پر دھنیں بج رہی تھیں۔ سب سے پہلے ہمارے سامنے ہوائی کی مشہور ڈش لومی لومی آئی یہ ٹماٹر کا کچومر تھا جس میں سامن مچھلی کا بھرتہ ملا ہوا تھا۔ کیونکہ نام ہی "لومی لومی" تھا اور مزا بھی اس سے وابستہ، لہٰذا وہ ڈش چٹم کر گئے اور یہ بھی جان بوجھ کر بھول گئے کہ ہم براہمن ہیں اور کچی مچھلی نہیں کھاتے۔ پھر اگلی ڈش اس سے بھی زیادہ پر اسرار تھی۔ ساگ میں لپٹا ہوا ہرا ہرا لڈو ہمارے سامنے آیا۔ بتایا گیا کہ یہ ساگ نہیں ہے بلکہ "ٹی پات" (TI LEAVES) ہیں۔ جس میں مرغی دم دی گئی ہے۔ ساگ کو ہٹایا تو بیچ میں سے گرم گرم نہایت مزیدار گوشت نکلا۔ یہ گوشت "ایمو" یعنی پتھروں کے تندور میں پکایا جاتا ہے۔ ہم بہت متاثر ہوئے۔ بعد میں کسی شریر نے سرگوشی کی کہ یہ خنزیر ہے۔ ہم نے کہا جو بھی تھا۔ بہت لذیذ تھا۔ بہر حال اب تو "ایمان می خورم" کیا ہو سکتا ہے۔ عموماً یہ ڈش سور کے گوشت سے بنتی ہے۔ لیکن اس رات مرغی سے پکائی گئی تھی۔ اس کے بعد ناریل کے دودھ سے پکی ہوئی سفید لوازنیں آئیں۔ یہ فوراً منہ میں گھل گئیں۔ خیر صاحب

بعد از طعام جشن رقص و سرود منعقد ہوا۔ ہوائی کا بہترین طائفہ سلام کے لیے سامنے آیا۔ اس کی پیش رو ایک جامہ زیب مادام تھیں۔ جن میں مشرق کا نمک بہت حلول کر چکا تھا۔ اس ٹیم نے ہوائی کے روائتی لوک گیت اور رقص دکھائے۔ یہ اندازہ ہوا کہ ہوائی کی موسیقی میں تنوع

ذرا بھی نہیں ہے اور نہ ہی زیادہ اتار چڑھاؤ. کیونکہ اس موسیقی کی بنا مذہب سے ہوئی اور ان کے دیوتاؤں کے حضور میں یہ گانے منتروں کی طرح پڑھے جاتے تھے. اس لیے یہ آج بھی وہی منتر لگتے ہیں رین. رین. رین. دین. رین ایک صوتی رہٹ چل رہا ہے. طبیعت بدمزہ ہو گئی. خیر ان کے موسیقی کے مختلف ساز ہمارے لیے ایک دریافت ہی تھے. "اکلیلی" ایک گیتار کی طرح ہوتی ہے. صرف چار تار ہوتے ہیں اور یہ بخوبی ہوائی موسیقی کے تقاضے پورے کر لیتی ہے. دوسری بانس کی تراشی ہوئی چھڑیاں ہوتی ہیں. ان کے چھناکے سے تال دی جاتی ہے. ان "گوپوالی" کہتے ہیں. ہمارے طبلے کی جگہ ان کے پاس دو سو کھے سو کھے کدو ہیں. جنہیں وہ زمین پر تھاپ دیتے ہیں اور طبلے کا نام "ای پو" ہے ہسپانوی "کیسٹا نیٹ" CASTANETS کی جگہ ان کے پاس ننھے ننھے کھپیٹے ہیں اور ان سے وہی کٹک کٹک تال ملتی ہے۔

ہوائی کا ناچ جو "ہولا" کے نام سے تشہیر پا چکا ہے. ایک سویا سویا کھویا کھویا رقص ہے جسے بے آواز لوری کہا جائے تو بہتر ہوگا. دھیمے دھیمے ہاتھ اور دھیمے پیر جو ہلتے بھی نہیں. ننھی ننھی نحیف موجوں کی طرح جو ابھرنے سے پہلے ڈوب جائیں۔

اگر اصلی جاندار "ہولا" دیکھنا ہو تو جزائر تہیتی (TAHITI) کا دیکھو. سویا انسان جاگ اٹھے اور جاگا انسان پھڑکنے لگے. یہ مشکل فن ہے جو مصری "بیلی ڈانسر" سے کسی طرح کم نہیں. تکنیک ایک ہی ہے. فرق صرف جسم کے جغرافیے کا ہے. مصری ناچ میں صرف پیٹ پھڑکتا ہے. "تہتش" ہولا میں صرف کولہے، اوپر کا حصہ ساکت اور صرف کمر کے نیچے زلزلہ آیا ہوا. رگ رگ پھڑکتی ہے اور موسیقی تیز سے تیز تر اور رقاصہ کا جوبن پر آ کر تھرکنا خوب تر. لطف آ گیا. ہم تو مرنے سے پہلے تہیتی ضرور جائیں گے. یہ خواہش ہم اکثر اسی انداز میں کرتے ہیں کہ ایک دن ہمارے میاں زچ ہو کر بولے ۔ "تمہارے مرنے میں کافی دقت ہے اور کرۂ ارض کے فاصلے کم ہوتے جا رہے ہیں. اس لیے کوئی ارمان نہ رکھو!"

ابھی تک تو میں اپنی بے تکی بڑ ہانک رہی تھی لیکن جزائر ہوائی بلکہ سارے جزائر جنوبی بحرالکاہل

کو سمجھنے کے لیے اس کا تاریخی پس منظر جاننا ضروری ہے. چونکہ تاریخ کا انسان سے واسطہ ہے اس لیے جب انسان برسر پیکار ہوتا ہے تو مورّخ قلم سنبھال لیتا ہے لیکن تاریخ سے بھی پہلے ایک خاموش ڈراما بروئے کار آتا ہے جس کا چکر ہزاروں نہیں بلکہ کروڑوں سال کا ہوتا ہے۔ اور وہ ہے ارضیات! GEOLOGY

جزائرِ ہوائی، مٹی کی ننھی ننھی بوندیوں کی طرح پچھلے چالیس ہزار سال سے اس بیکراں سمندر میں کئی دفعہ ابھرے اور کئی دفعہ ڈوبے لیکن شاباش ہے وقت کو! اس کا صبر، اس کا ظرف غیر محدود ہے. وقت آہستہ آہستہ گزرتا گیا اور یہ نامعلوم کاہل جزیرے جن کے سینے میں آگ اور جن کی سطح پر جزگیاہ کچھ نہ تھا. بتدریج اوراقِ ہستی پر ایک اہمیت اختیار کرتے گئے۔

اکثر مورّخوں کا کہنا ہے کہ جنوبی اور مشرقی ایشیا سے من چلے ملاحوں کے خاندان جوق در جوق کشتیوں میں اپنا سارا متاعِ حیات رکھ کر وقتاً فوقتاً ان جزائر میں بستے گئے. عقل دنگ ہے کہ پندرہ سو سال پہلے جب جہازرانی اپنی ابتدائی منزل تک نہیں پہنچی تھی. یہ نڈر ایشائی ان نازک چوبی سفینوں میں کس طرح اس اژدھے کو پار کرتے ہوں گے جو سارا وقت جبڑا کھولے نگلنے کو تیار ہے. واللّٰہ اعلم اس کو بحرالکاہل کس نے کہا. بے چین روح ہر وقت طوفان کے سر پر سوار رہتی ہے. خیر تو شاباش ہے ان سیلانی جوڑوں پر جو نہ صرف خود آ کر بسے بلکہ اپنے ساتھ کشتیوں میں ایشیا کے پھل پھول اور نباتات بھی رکھ لائے. گائے بکری بھی لے آئے اور کچھ دستی ہنر بھی پار کر لائے۔

ایک دو مورّخوں کا کہنا ہے کہ یہ "پولی نیزین" POLYNESIANS اصل میں وہ شمالی "انڈین" تھے جو موجوں کی صورت میں رہ رہ کر اڈتے اور کینیڈا، امریکہ اور لاطینی امریکہ میں بستے گئے. انہی کا بچا کھچا بیڑا جزائرِ ہوائی تک بھی آیا. لیکن نہ مجھے اس نظریئے سے اتفاق ہے نہ عموماً مورّخوں کو. کیونکہ پھل پھول، سبزیاں وغیرہ جو بھی ان جزائر میں پائے جاتے ہیں سب جنوبی ہند کے ہیں تو یہ "پولی نیزی" بہت مہذب اور امن پسند تھے آپس میں ان کی تقسیم چودھراہٹ کی بنا پر ہو گئی. کوئی ایک جزیرے کا ننھا سا راجہ بن گیا کوئی دوسرے کا لیکن خونریزی معیوب اور

معدوم تھی، گو یہ قومیں بت پرست اور نیم برہنہ تھیں لیکن ان میں ایک اخلاقی شائستگی حیا اور اصول تھے۔ ان معصوم قبیلوں کو ان فرنگیوں نے آکر خوب پٹی پڑھائی اور کیا کیا عطیے دیئے۔ مثلاً سامراجی سازش اور جنگ و جدل، فولادی اور بارودی ہتھیاروں کا استعمال۔ حرصِ زن و زمین، اور ہر نوع کے امراض "پولی نیزی" بہت خوش باش اور صحت مند تھے۔ جب اٹھارویں صدی میں سفید چمڑی نے ان کی طرف رخ کیا تو بے چاروں کو ہر قسم کا جسمانی اور روحانی روگ لگا دیا۔ اگر ۱۷۷۸ء میں ایک منچلا کیپٹن کُک (CAPT COOK) ان جزائر کو دریافت نہ کرتا تو انسانیت پر بہت احسان کرتا۔ یہ کپتان اپنی ملکہ الزبتھ کا پرچم لے کر سب مظلوم اور نہتے جزیروں کو اسیر کرنے نکلا ہوا تھا۔ جب جزائر ہوائی پہنچا تو دور بیڑا روک کر بھر ملاقات سرداروں کو سلام بھیجا۔ اسی اثنائیں ہوائی کے صنم کدوں میں ایک پیشن گوئی ہو چکی تھی کہ آکاش سے ایک دیوتا آنے والا ہے۔ یہ بھلے مانس کیپٹن کُک کو دیوتا سمجھ بیٹھے اور کئی ہفتے اس کی اور اس کے جہاز رانوں کی خوب آؤ بھگت کی۔ ان کی کشتیاں میٹھے پانی پھل اور صندل جیسی قیمتی پیداوار سے بھر دیں۔ حتیٰ کہ اپنی دوشیزائیں بھی اس دیوتا کے سامنے پیش کر دیں۔ لیکن انہی دنوں ایک مہلک وبا سے کئی اموات ہو گئیں۔ جزیرے کے باشندوں نے "کیپٹن کُک سے فرمائش کی کہ اگر تم دیوتا ہو تو اس وبا کو روکو۔ اب تو دیوتا کو اپنا بوریا بستر سمیٹنا پڑا۔ ادھر ان باشندوں کی پرستش میں بھی خلل آگیا۔ چونکہ ان جزائر میں فولاد بالکل نہیں تھا۔ اس لیے باشندوں نے اپنے دیوتا کے جہاز میں سے دو کشتیاں چرا کر جلا دیں تاکہ لوہے کی کیلیں نکال لیں۔ اس بات پہ جھڑپ ہو گئی۔ کپتان نے حملے کا حکم دیا۔ ادھر ایک تیر خود کپتان کے لگ گیا جس سے وہ کراہنے لگا۔ باشندوں کو فوراً احساس ہوا کہ یہ کپتان دیوتا نہیں ہو سکتا۔ دیوتا تو کراہتے ہی نہیں۔ اتنا سمجھنا تھا کہ باشندے "کیپٹن کُک" پر پل پڑے اور اس کی بوٹی بوٹی کر ڈالی۔ البتہ برائے پرستش اس کی ہڈیاں مختلف مندروں میں بھجوا دیں۔

اس سانحے کے بعد جزائر نے فولاد کی اہمیت پہچانی اور فولاد ہر قیمت پر خریدنا شروع کر دیا۔ لیکن فرنگی صرف سپاہی نہیں بلکہ بیوپاری بھی ہوتا ہے۔ بیوپار میں بھی مات دے گیا۔ ذرا ذرا

سے لوہے کے ٹکڑوں کے عوض منوں کیوڑہ ، زعفران اور صندل بٹور کر لے گیا۔

اس سانحے کے بعد ان جزائر کی آبادی نصف رہ گئی۔ حالانکہ "پولی نیزی" بہت زور آور اور جسیم تھے لیکن نازک طبع اور حساس بھی تھے۔ سمندری سامراجیوں کی دہشت اور ان کے بخشے ہوئے امراض سے آدھے باشندے چٹ پٹ ہو گئے۔ رہی سہی کسر امریکیوں نے پوری کر دی۔ بقیہ ممالک تو صرف لوٹ کر آگے بڑھ جاتے تھے۔ امریکہ کے "یانکی" YANKEE نے کھسوٹا بھی اور پھر دھرنا مار کر بیٹھ بھی گیا اور اس پر طرّہ یہ کہ اپنے ساتھ تبلیغی جماعتیں بھی لے آیا جنہیں "مشنری" کہا جاتا ہے دنیا میں مغرب کی کامیابی کا راز آہنی مشینری اور کلیسائی مشنری ہیں۔ بلکہ یہ مشین سے پہلے پہنچ کر اپنے "مشن" کھول لیتے ہیں اور مغربی تسلط کے لیے معاشرے کی زمین تیار کر لیتے ہیں۔ بقیہ ممالک میں ان مبلغوں نے اگر بُرے کام کئے ہیں تو بے شمار اچھے کام بھی کیے ہیں۔ لیکن ہوائی میں ان مشنریوں کا اعمال نامہ ضرورت سے زیادہ سیاہ ہے۔ یہ اپنے دعوے کے مطابق کافروں کو خدا سے متعارف کرانے آئے تھے۔ ان کے نیم برہنہ جسم سے گھاس کی گھگھریاں اتار کر اپنے "گاؤن" پہنانے آئے تھے۔ بہ الفاظ دیگر اپنا برتر معاشرہ جہازوں پر لاد کر لائے جو ان کے سر منڈھ دیا۔ مگر اپنا مذہب بیچتے بیچتے خود ہوائی کی سب جاگیریں خرید لیں۔ آج تک ان جزائر میں یہ لطیفہ زبان زد خاص و عام ہے کہ مشنری آئے۔ ہم باشندوں سے واعظ میں کہا "آنکھیں بند کر کے ہاتھ جوڑ کر خدا سے لو لگاؤ اور آسمان کی طرف منہ کرو۔" جب ہم نے آنکھیں کھولیں تو ہماری زمینیں غائب تھیں۔ یہ حقیقت نہ صرف "جیمز مچنر" نے اپنی مشہور کتاب میں لکھی بلکہ "ڈاکٹر فیوکس (DR FUKES) نے بھی اپنی ضخیم اور لاجواب کتاب میں اس کی تائید کی ہے۔ گو ہوائی کے دیرینہ مشنری خاندان ان اشاعتوں سے بہت نالاں ہیں اور کوشاں ہیں کہ کم سے کم ڈاکٹر فیوکس کی کتاب باقی ملکوں میں نہ جائے۔

ہوائی کی پرانی تاریخ کا آخری دور ۱۸۳۵ء سے ۱۸۹۵ء تک شہنشاہیت کا تھا جو امریکی صلاح کار اور وزرا کے بل بوتے پر چلائی گئی۔ مختلف بادشاہ اپنے مقررہ وقفے کے لیے آئے

اور لاج کر کے چلے گئے یا ہٹا دیئے گئے۔ اس دور میں امریکہ کے تاجروں کی گرفت مضبوط ہو چکی تھی۔ اس لیے ہر حکمران ان کے اشارے پر ناچتا تھا۔ آخری ملکہ "للیو کلیانی" نے ذرا خود مختاری دکھائی تو اسے زبردستی دیس نکالا مل گیا۔ اس وقت تک امریکہ کا سرمایہ ہوائی کی زراعت اور صنعت پر غالب آ چکا تھا۔ گنے اور اناس کے بیوپار میں یہ "یانکی" کروڑپتی ہو چکے تھے۔ کھیتوں کے کام کرنے کے لیے چین، جاپان، کوریا، فلپائن سے لاکھوں مزدور پا بہ زنجیر پکڑ کر لائے گئے تھے۔ ان مزدوروں کے خون پسینے سے ہوائی کے سفید سیٹھ SUGAR BARONS دنیا میں ایک محاورہ بن گئے۔ ڈاکٹر لنڈر DR LYND، نے اپنی کتاب میں انہیں۔

"THE TIGHTEST ECONOMIC OLIGARCHY IN THE WORLD"

کہا ہے۔ ان مشرق بعید کے زرخرید مزدوروں سے ہوائی کی ماڈرن تاریخ کا نیا باب شروع ہوتا ہے۔ یہ ایشیائی فرقے ایک نسل تک تو فاقے کرتے اور کوڑے کھاتے رہے لیکن اپنی محنت، جفاکشی اور ایثار سے ۵۰ سال کے اندر اندر مزدور طبقے سے متوسط طبقے میں شامل ہو گئے۔ دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے جاپانیوں پر بہت شکوک کیے گئے اور بے جا مظالم بھی ہوئے لیکن آفرین ان ایشائی مزدوروں کا کہ اس صبر و ہمت سے انہوں نے سر جوڑ کر سفید یہودیوں اور سود خوروں کا مقابلہ کیا ہے کہ آج ہوائی کا ساٹھ فیصدی کاروباری انتظام (پیسہ نہیں) چینیوں کے ہاتھ میں ہے۔ حالانکہ وہ وہاں کی آبادی میں آٹے میں نمک کی حیثیت رکھتے ہیں اور کل چھ فی صدی ہیں۔ چینیوں کی شرح آمدنی ہوائی میں فی کس سب سے زیادہ ہے۔ یہ قوم بہت محنتی اور علم جو ہے حالانکہ ان کی اقتصادی شروعات ادنیٰ، مشترکہ بیوپار، کریڈٹ یونین اور انجمن امداد باہمی چھوٹے چھوٹے بینکوں سے ہوئی۔ آج یہ سب گندمی اور پیلی چمڑیاں مل کر امریکی سامراج اور امریکی سرمایہ داری کا مقابلہ کر رہی ہیں۔

اور آج چینی جاپانیوں کا اپنا الگ "چیمبر آف کامرس" اور اپنا ایک الگ بینک ہے۔ بظاہر امریکہ دعویٰ کرتا ہے کہ ہوائی میں یک جہتی ہے، ملاپ ہے۔ لیکن سطح کے نیچے بہت تلخ یادیں

وابستہ ہیں۔ جاپانی بھول نہیں سکتے کہ پچھلی جنگ میں ان کی جوان پلٹن اس لیے جرمنی جرنیل رومیل کے خلاف کٹوا دی گئی تھی تاکہ بھاگتی ہوئی امریکی فوج کو آڑ مل سکے نہ یہ ایشیائی قومیں وہ ذلت اور عزت بھولی ہیں جو ان کے آباؤ اجداد کو سہنی پڑی تھیں اور نہ وہ اس دھونس کو بھول سکتے ہیں جو سائے وقت ان کے سر پر منڈلا رہی ہے۔ وہ ذرا بھی سست پڑے تو وہ سفید سرمایہ ان کو ہڑپ کر جائے گا۔ سیاست میں ان کی تعداد معنی رکھتی ہے۔ مثلاً آبادی میں جاپانی تیس فیصد ہیں اور چینی چھ فیصد باقی مختلف ممالک کے لیکن سفید باشندے ہیں۔ جنھیں "کوہ قافی (CAU CASIANS)" کہا جاتا ہے اور یہ بتیس فیصدی سے زیادہ ہوتے جا رہے ہیں اور امریکی پالیسی کا خاص مقصد یہ ہے کہ چپکے چپکے سفید افراد کو ہوائی سمگل کیا جائے۔ تاکہ الیکشن میں سفید "ووٹیں" غالب رہیں۔ ان خوف و شکوک کی حالت میں ایک اندرونی ہیجان اور تناؤ ہے جو عام سیاحوں کو نظر نہیں آتا۔ بظاہر تو سب نکٹے چپٹے پیلے گورے ایک ہی معاشرے کا شکار نظر آتے ہیں۔ لیکن اس "سیلوتح کلچر" کی زیر سطح دھیمی دھیمی آگ سلگ رہی ہے۔

خیر تو قصہ مختصر ۱۸۹۸ء میں امریکہ کو ہوائی کی کاروباری اہمیت کے علاوہ اس کی بین الاقوامی حیثیت کا بھی اندازہ ہوا۔ اور آخری جنگ میں "پرل ہاربر" کے سانحے کے بعد امریکہ نے عہد کر لیا کہ اسے اپنی ایشیائی بحری طاقتوں کا آخری قلعہ بنائے گا۔ برسوں کی تگ و دو کے بعد ۱۹۵۹ء میں صدر "آئزن ہاور" نے ہوائی کو امریکہ کی پچاسویں ریاست بنانے کا اعلان کر دیا۔ اللہ بھرتے کو بھرتا ہے اس صدی میں جب باقی سامراج افریقہ، ایشیا سے اپنے پنجے نکال رہے ہیں۔ امریکہ اپنی سلطنت بڑھاتا جا رہا ہے۔ ہوائی سے پہلے "الاسکا" بھی دبوچ لیا تھا۔ اس طرح فلپین، تھائی لینڈ، ویت نام، لاؤس وغیرہ بھی رکوع میں جا رہے ہیں اور جو نظر آ رہا ہے انشاءاللہ ہندوستان بھی امریکہ کی آخری فتح اور باونویں ریاست ہوگی۔ یہ تو تھی اس آبی قوم کی خشک اور سرسری داستان!

ہوائی میں ایک کھیل بہت مزے سے کھیلا جاتا ہے وہ ہے "بوجھو تو جانیں"؟ آپ کسی فٹ پاتھ پر ایک طرف کھڑے ہو جائیے دور راہرو کے صرف چہرے کو دیکھ کر پہچانیئے کہ اس فرد میں خون

کی کتنی بوندیں چینی، کتنی جاپانی، کتنی یورپی اور کتنی امریکی ہیں۔ ریسرچ کے عالم بتاتے ہیں کہ ان ننھے منے جزائر میں ۵۲ اقسام کے مختلف چہرے اور نسلیں ہیں۔ اصلی باشندے تو صرف ایک فیصدرہ گئے ہیں۔ لیکن انہوں نے دو صدیوں سے بیرونی قوموں سے ناطے جوڑ کر اپنے محدود خون کو لاکھوں ذاتوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اگر اتفاق سے آپ کو کیلے کے درخت برابر لمبا اور بڑ کے درخت برابر چوڑا گندمی رنگت کا مرد نظر آئے جس کے ہونٹ موٹے موٹے، بال ہلکے گھنگھریالے اور تقریباً کالے ہوں۔ آنکھیں گول گول اور ناک سے دُور دُور ہوں تو یہ ہے اصل نسل۔ ہوائی کا رہنے والا۔ لیکن ایسے صرف دو چار ہی ہیں جو تھیئٹر تماشوں میں برائے نمائش سجائے گئے ہیں۔ کچھ ضعیف عورتیں کبھی کبھار مل جاتی ہیں اور وہ اس طرح آہیں بھر کر ہوائی کی پرانی عظمت اور آزادی کا ذکر کرتی ہیں جس طرح ہماری نانی دادیاں اصلی گھی اور سفید گھوڑوں کی فٹنوں کا۔ یہ ہوائی کے وہ محدود چند اداس چہرے ہیں جنہوں نے نئے دور اور نئی اقدار کے ساتھ کسی قیمت پر مطابقت نہیں کی۔ یہ امریکنوں کو ہاتھ اٹھا اٹھا کر کوستے ہیں۔ اس اصلی اقلیت کو پہچاننے کے بعد آپ کا اللہ حافظ ہر فرنگی منچلے کا روماں یا بسیرا۔ کوریا سے لے کر ٹونگالینڈ تک اور ہالینڈ سے لے کر جرمنی تک ہر غلام مزدور کا عقد یا نقد وہ رنگ لایا ہے کہ بھانت بھانت کے ان مل، بے جوڑ نقوش و رنگین جسم چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ نسلی تنوع ہوائی کا سب سے بڑا معرکہ اور سحر ہے اور اس کی سب سے دلچسپ بھول بھلیاں!! حالانکہ یہ سب قومیں اب اتنی مخلوط ہو گئی ہیں کہ اپنی اصلیت کھو بیٹھی ہیں لیکن پھر بھی ہر گھرانہ اپنے آبائی ملک کی یاد میں کوئی نہ کوئی رسم اور رواج برقرار رکھے ہوئے ہے: جاپانی اپنے جنت رسیدہ بزرگان کی برسی "بون" رقص کے ساتھ مناتے ہیں۔ جس میں بانسریوں کی دھنیں اور ننھی ننھی مشعلیں، کشتیاں، پانی میں تھرکتی ہیں۔ چینی اپنا سال نو گلِ نرگس کے جشن سے مناتے ہیں اور اس میں اژدھوں اور رانی گھوڑوں والے رقص کرتے ہیں۔

جس طرح ایک پاکستانی امریکہ فتح کر لے تو وہاں کے ایک چوک کا نام گھنٹہ گھر رکھے گا۔ اور کسی سڑک کا نام بندر روڈ۔ اسی طرح ان قوموں نے بھی ہوائی میں اپنی جدی یادگاریں بنائی

ہوئی ہیں. شہر کے اندر ایک ننھے سے محلے کا نام ہے "چھوٹا ٹوکیو"۔ ایک کا عنوان ہے 'ننھا منیلا' ایک اور گلی جس میں سے سوئے سوس (SOY SAUCE) کی خوشبو آتی ہے "چائنا ٹاؤن" کے مانوس نام سے مشہور ہے یہ محلے اپنے اپنے معاشرے کی حفاظت میں ڈٹے ہیں اور امریکی یلغار جس کا نام کو کا کولا اور 'ہیم برگر' اور 'جینز' ہے دور رکھنے کے لیے کوشاں ہیں. ان فرقوں کے اپنے اپنے کلب ہیں. جن میں غیر مشکل سے باریابی پاتے ہیں. حالانکہ آپس میں ازدواجی اختلاط بڑھتا جا رہا ہے لیکن پھر بھی جاپانی ماں پسند نہیں کرتی کہ اس کی بیٹی فرنگی کے ساتھ شام گزارے اور امریکی خاندان اپنے لڑکے کا چینی یا "سموآ" کی دوشیزہ کے ساتھ میل جول قبول نہیں کرتا. میرے خیال میں ایک نسل کے بعد یہ سب اختلافات اور تعصبات غائب ہوں گے اور کیا معلوم شاید بڑھ بھی جائیں. افسوس کہ سیاست اور اقتصادیات نے انسانیت کی تلخی کو کم کرنے میں کبھی کوئی مدد نہیں کی.

جہاں اتنی قومیں ہوں وہاں اتنے ہی مذاہب بھی ہوں گے. ہوائی کے دارالسلطنت میں ایک جگہ چھ میل کے اندر اندر ایک کلیسا، ایک بدھ مندر، ایک مورمن کا عبادت کدہ، ایک شنٹو کا جاپانی روح کدہ، ایک بہائی کا مجلس کدہ، ہوائی مذہب کا صنم کدہ، آریہ پوجا گھر ہے ۔ بہائی مذہب جوان طلبا میں بہت ہر دل عزیز ہو رہا ہے. غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں کوئی صوم و صلوٰۃ کی پابندی نہیں ہے. ویسے بھی ہوائی میں تنگ نظری مفقود ہے. اکثر افراد کے ایک ہاتھ میں انجیل ہوتی ہے اور دوسرے ہاتھ میں زین بدھ ازم کی کتاب ۔

کُل ہوائی سات جزائر پر مشتمل ہے جو دنیا کے نقشے پر اتنے معدوم نقطے ہیں کہ عقل دنگ ہے کہ یہ دریافت کیسے ہوئے. باقی جزائر پر انسانی آبادی نہیں ہے وہ حرف غلط کی طرح ابھرتے اور مٹتے رہتے ہیں. ان سات جزائر میں سے اواہو (OAHU) اس لیے مشہور ہے کہ اس کا مرکز ہونولولو ہے. جس کے نام سے ہر سیاح کے دل میں ولولے جاگ اٹھتے ہیں، اس کا ذکر تو فرصت سے بعد میں آئے گا. ان جزائر کی سحر انگیزی کا راز یہ ہے کہ یہ سب خوابیدہ آتش فشاں

ہیں۔ ان کی حرارت میں ہر "ٹروپیکل" پیداوار پھل پھول اگتے ہیں۔ ان کی بعض برفانی کلغیوں پر سرد ممالک کے برگ وگیاہ پائے جاتے ہیں۔ ان جزائر کی ننھی سی جانوں میں اتنا موسمی تنوع ہے کہ "آدھ گھنٹے" کی کار کی دوڑ میں آپ سویٹر پہن لیجئے اور رات کو صحن میں آگ جلائیے اور یا آدھ گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد سب کپڑے پھینک کر پیراہن پری پہنئے اور نیلے پانیوں میں کود جائیے۔ لکھنے کو تو انسان بہت کچھ لکھ سکتا ہے لیکن اختصار کے تقاضے کے ماتحت چند سطور ہر جزیرے پر لکھی جا سکتی ہیں۔

ہوائی اس کو "بڑا جزیرہ" (BIG ISLAND) کہتے ہیں لیکن میں اس کو گلستانوں کا قلب کہوں گی۔ تمام امریکہ اور باقی دنیا کو پھول اسی جزیرے سے برآمد ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس کی زیرلویں میں گل و شجر کی بائیس ہزار اقسام ہیں۔ جہاں تک نظر جاتی ہے پھولوں کی کیاریاں ہی کیاریاں ہیں۔

اس کے دو بیدار جوالا مکھی بے ضرر ہیں لیکن بے زر نہیں۔ امریکنوں کی طرح انہیں بھی پیسہ کمانا آتا ہے۔ جب ان سے آتش بازیاں پھوٹتی ہیں تو چھ چھ دن سارے جزیرہ کا ٹریفک بند ہو جاتا ہے۔ اور ہر سیاح اس آتش زاد دیوی کے درشن کے لیے کیمرے اور دوربینیں لے کر پہنچ جاتا ہے۔ کبھی کبھی یہ آتشیں فوارے ۷۰۰ افٹ تک کی بلندی پر چھوٹتے ہیں اور مردہ مٹی پر لاوا کے زعفرانی مرغزار پھیلا جاتے ہیں۔

ماؤی (MAUI) ہوائی کے سات جزیرے سات سہاگنوں کی طرح ہر سنگھار سے مزین ہیں لیکن ان سات سہاگنوں میں اگر کوئی نمایاں طور پر حسین ہے تو وہ "ماؤی" ہے اس کو تضاد کا جزیرہ کہتے ہیں کیونکہ دو آتش فشاں پہاڑوں کے بیچ میں سرخ زمین کی وادی ہے جس کے ایک طرف خشک ویران صحرا ہے۔ دوسری طرف ہر وقت بارش ہوتی رہتی ہے۔ ماؤی حکایت و روایت میں بہت گہری ڈوبی ہوئی ہے کہتے ہیں ایک مچھیرے دیوتا نے مچھلیاں پکڑتے پکڑتے اپنے جال میں اس جزیرے کو پھانس کر سمندر کی گود میں سے باہر نکالا۔ اسی دیوتا نے سورج کو نظر بند کر کے اس کی حرارت کم کی اور اس کی آگ چرا کر انسان کو تحفتاً لا کر دی۔

دنیا کا سب سے بڑا خستہ جوالا اس جزیرے میں ہے جوالا کا منہ اتنا بڑا ہے کہ اس کو "سورج کا بسیرا" کہتے ہیں. ان جزائر میں 'ماؤ دی' ایک محاورہ بن گیا ہے. اگر کسی تعریف کو نقطۂ عروج تک پہنچانا ہو تو کہا جاتا ہے "ماؤ دی"!!

اس جزیرے کی شہرت کے دو راز ہیں. ایک تو جوالا کے منہ میں ایک خاص قسم کا پودا (SILVER SWORD) اُگتا ہے جو پھول گوبھی کی طرح پھیلتا جاتا ہے اور اس کی شاخیں روپہلی تیروں کی طرح اوپر اٹھی ہوتی ہیں. یہ پودا دنیا میں اور کہیں نہیں پایا جاتا. دوسرے اس جزیرے میں بہترین گھوڑے، بہترین کاؤبوائے. بہترین چوگان باز اور بہترین ٹماٹر ہوتے ہیں اور دنیا میں سب سے بڑی گنے کی فصل یہاں اُگتی ہے.

"کووائی" (KAUVI) کو فردوس ثانی کہا جاتا ہے. یہ سبز ترین جزیرہ ہے اس کی ایک کوہستانی کلغی دنیا کی سب سے زیادہ گیلی زمین ہے (۴۶۵ انچ بارش فی سال) کہاوت ہے کہ اس جزیرے کی بنا بھی جل پریوں نے ڈالی تھی. ان شبستانی شہریوں نے راتوں رات جزیرے کے آبشار اور وادیاں بنائیں اور خود اپنے ڈیرے ڈال دیئے. سنا ہے یہ جل پریاں صرف شکر قند اور ناریل کے ملیدے پر زندہ تھیں. کچھ باشندوں کا عقیدہ ہے کہ اب تک یہ پودنی پریاں "کووائی" کے جنگلوں میں چھپی ہوئی ہیں اور چاندنی رات میں ہولا ناچنے باہر آتی ہیں.

اس کی ایک جگہ ناقابل فراموش ہے. وہ ہے "فرن گروٹو" (FERN GROTTO) یہ ایک خنک غار ہے جس کے دہانے پر ۸۰ فٹ سے یہ "فرن" دیوزاد گیسوؤں کی طرح لٹک رہے ہیں.

"نی ای یاؤ" (NUHAU) یہ جزیرہ ابھی اٹھارویں صدی میں مقیم ہے. یہ سب سے چھوٹا اور سب سے پراسرار جزیرہ ہے. اس میں کوئی سیاح نہیں جا سکتا اور اچھا بھی ہے، ورنہ سیاح بیسویں صدی کے جراثیم بھی اپنے ساتھ لے جائے گا. یہ جزیرہ ہوائی کا قدیم کلچر اپنے پروں کے نیچے چھپائے بیٹھا ہے اور اس کی کسی کو ہوا بھی لگنے نہیں دیتا.

اس کی تاریخ بہت دلچسپ ہے۔ ہوائی کے مشہور بادشاہ "کیمھا کیمھا" (KAMEHA
KAMEHA) THE GREAT " نے اس جزیرے کو سکاٹ لینڈ کے ایک خاندان "رد بن سنز" کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ جنھوں نے یہ عہد کر لیا کہ جدید تہذیب کا گزر ادھر سے نہیں ہونے دیں گے۔ اس لیے یہ جزیرہ باقی دنیا کے لیے بند ہے۔ کوئی ہوائی جہاز نہیں جا سکتا۔ کسی بڑے آبی جہاز کا راستہ نہیں خود اس کے مالک کشتیوں میں آتے جاتے ہیں۔

یہاں پر دو سو اصیل نجیب الطرفین ہوائی خاندان آباد ہیں جو کاشتکاری کرتے اور بھیڑ بکریاں چراتے ہیں۔ یہاں مراسلات اور اطلاعات کی گنجائش نہیں۔ نہ ڈاکخانہ، نہ ہرکارے، نہ سینما، نہ ریڈیو نہ ٹیلیفون، نہ پولیس، نہ سیاست دان، انسانی معاشرہ اس سے بڑی مہاکتی اور کیا چاہ سکتا ہے۔

یہ ہوائی شے کیا ہے؟ ہوائی میں پہنچ کر سب سے پہلے سیاح پوچھتا ہے کہ اصلی ہوائی کہاں ہے؟ کدھر ہیں وہ فطری باشندے اور گھاس کی گھگھریاں؟ مجھ سے تو صرف یہ جواب بن بڑے گا کہ گھاس کی گھپنیاں تو کھا گئیں "مشنریوں" کی بکریاں۔ اور اصلی جزیرہ کھا گیا یہ معاشرہ۔ آج کا ہوائی اس طرح امریکنیت میں غلطاں ہے کہ امریکہ کا بس چلتا تو سمندر بھی ناک میں بولتا اور ہر درخت کا کرو کٹ، (CREWCUT) ہوتا۔ ہوائی کا اصلی معاشرہ یا تو عجائب گھروں میں حنوط شدہ ہے یا امراؤ بازاروں میں تماشہ بن کر بکتا ہے۔ یا مورمن مذہب کے "پولی نیزی مرکز" میں ہر ہفتے ایک غمگیں یادگار رنگین تازیہ بن کر جلوس کی صورت میں سیاحوں کے لیے نکلتا ہے۔

اگر کوئی مجھ سے کہے کہ صرف ایک لفظ میں ان جزائر کی صفت بیان کرو، تو میں کہوں گی ملائم۔ ان کا آسمان ملائم، ان کا آفتاب ملائم، ان کی ہوائیں ملائم، ان کی موجیں ملائم، ان کے برگ و گیاہ ملائم، ایسے کچے کچے ہرے ہرے مرغزار کہ دل چاہتا ہے کھیرے ککڑی کی طرح سب کچر کچر کر چبا جاؤں۔

ان کے باشندے ملیح و ملائم، ان کی زبان نرم و شیریں، ان کے گیت، ان کے رقص ہلکے پھلکے

ان کی ساری کائناتی اور معاشرتی فضا سہل لب، سہل قدم، ان جزائر میں اُونچی آواز سے بولنے کو جی نہیں چاہتا کہ کہیں ان کی ہم آہنگی چیخ نہ جائے۔ کرخت لہجہ یا درشت الفاظ اس فضا میں انجان دہقان معلوم ہوں گے۔ یہ جزائر صرف مہر و محبت کے لیے تھے۔ ان کی خونیں اور تیرہ بخت تاریخ سے قطع نظر یہ آبی سلطنت انسان کو انسانیت کے لیے دی گئی تھی۔

یہاں کوئی موسم کی بات ہی نہیں کرتا۔ کیونکہ ضرورت ہی نہیں۔ ہمارے پاس سردی میں سوں سوں اور گرمی میں ہائے ہائے۔ یہاں سرما گرما کی مقیاس حرارت میں صرف دو ڈگری کا فرق ہے سارے سال فضا خوشگوار۔ سارے وقت ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوائیں۔ آتے جاتے خدا معلوم کہاں سے پھوار پڑ جاتی ہے۔ یہ پھوار چپ چپاتے دبے پاؤں کدھر سے آگئی! کدھر گئی! دن میں چار پانچ دفعہ پڑتی ہے اور دھیمی دھوپ میں بھی پڑتی رہتی ہے۔ یہ امتیاز مشکل ہو جاتا ہے کہ سورج کی کرنیں ہیں یا بادلوں کی تارکشی۔ اس لیے عوام اس پھوار کو "آبی دھوپ" کہتے ہیں۔

اس طرح موسم میں اگر کسی کا مزاج برہم ہو تو یا تو وہ ازلی دیوانہ ہے یا عشق کا دیوالیہ!

میرے لیے اس جزیرے کی سب سے بڑی خوبی اس کی آزادی تھی، ایک روحانی و ذہنی آزادی!! اس گمنامی کی آزادی جسے پانے والا ہی جانتا ہے یہاں کوئی نہ بیگم جانے۔ نہ مادام، کسی کو آپ کے نام اور کام سے واسطہ نہیں۔ سب اپنی اپنی تفریح، اپنی اپنی تفتیش میں مست، یہاں عمر کا تفرقہ مٹ جاتا ہے۔ ذات پات کا امتیاز مٹ جاتا ہے۔ یہاں بڈھے بھی جوان ہیں اور سیاحوں میں زیادہ تعداد ان کی ہوتی ہے جو ستّر پار کر چکے ہیں۔ ایسی ایسی بڑی بوڑھیاں جو ہمارے یہاں طاق پر بٹھا دی جاتی ہیں کہ تسبیح پھیریں اور قبر کا انتظار کریں۔

وہاں "بکنی" پوشاک پہن کر ساحلوں پر پہنچی ہوتی ہیں، عام بازاروں میں سڑکوں پر لوگ ننگے پیر نیم برہنہ پھرتے ہیں۔ حد ہے کہ بعض طلبا موجوں میں نہاتے نہاتے اسی لباس میں اٹھ کر کالج یونیورسٹی کی جماعتوں میں حاضری لگانے چلے جاتے ہیں۔ پروفیسر شاید پہلی دفعہ کھنکارا یا عینک کے پیچھے سے گھورا ہوگا اب وہ عادی ہو گیا ہے۔ کچھ اس فضا میں ڈھیل ہے۔ کوئی واعظ نہیں، کوئی

ناصح نہیں ہر ایک کے اعمال اس کے ساتھ، جیو اور جینے دو۔

مجھے تو سب سے زیادہ مزا طلبا کی کاریں دیکھنے میں آتا تھا۔ وہ پرانی سیکنڈ ہینڈ موٹروں کے مرگھٹ سے پرانے مردے دوبارہ زندہ کر لاتے تھے کہ ہنس ہنس کر انسان لوٹ جائے۔ جس ملک میں ہمارے لوگ زرے پیروں کی ٹکر پر لوگ نئی موٹریں ہوں اور وہ بھی نئی سے نئی چمکتی دمکتی وہاں یہ کھڑ توس کھٹارے جن کی دور سے دھک سُن کر بچے پرے ہٹ جاتے تھے ایک عجب پُر لطف منظاہرہ ہوتا تھا۔ ہمارے میاں نے بھی ایک پرانی فورڈ (اللہ جنت نصیب کرے) ایک ہزار میں خریدی۔ میں اس غریب کی غیبت ہرگز نہیں کروں گی۔ کیونکہ اس نے ایک دن دغا نہیں دی۔ آٹھ مہینے دن رات پھرائی گئی۔ پندرہ پندرہ سواریاں بھر بھر کر ہر ساحل ہر پہاڑ پر لے گئی۔ صرف اس میں یہ ستم تھا کہ جب رکتی تھی تو اس طرح آواز آتی تھی۔ گویا کوئی ہوائی جہاز پٹڑی پر سے اُتر کر بہک گیا ہو۔ اس کو بند بھی کر دو تو دیر تک بڑ بڑاتی رہتی تھی ہم نے نو مہینے میں اسے ایک دن صاف نہیں کیا۔ وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ پھر بھی چلتے وقت اسی قیمت پر بِکی جس پر خریدی تھی۔ مرحومہ بڑی وضعدار تھی۔

انسان یہاں اپنی عمر بھول جاتا ہے۔ سارے وقت جواں سال طبقہ کھیل تفریح کے نئے نئے ڈھنگ نکالتا رہتا ہے اور ہر کھیل کے لیے نئے نئے لباس تراشتا ہے۔ پیراکی کے لیے تو لباس کا نام لینا ہی غلط ہوگا۔ لڑکے نامعلوم سی لنگوٹی یا چڈی اور لڑکیاں دو کترنیں محض تکلفاً پہنتی تھیں!! وہاں کئی اصطبل کرائے پر چلتے ہیں اور جب سیاح سمندری سیروں پر نکل جاتے تو امیر لوگ تو موزوں لباس پہنتے تھے۔ لیکن طلبا وہی پیوند لگی جینز (JEANS)

ان طلبا کی جیبیں اکثر خالی ہوتی ہیں۔ اس لیے گھوڑے کا کرایہ بھی مانگ کر پورا کرتے تھے۔ کبھی امداد باہمی کے اصول پر دو گھنٹے کو ایک گھوڑا لیتے اور باری باری سواری کرتے۔ اس کے جنگلوں میں پھول اور نئی نباتات ڈھونڈھنا۔ پہاڑیوں پر سانس پھلانے والی چڑھائیاں کرنا۔ ہوٹلوں کے تالابوں میں آبی رقص کرنا (WATER BALLETS) شام ڈھلے تک

ماہی گیری کرنا، لیکن جب ان سب چیزوں سے بیزار ہوئے تو گرم خون نے ایک نئی تفریح اختراع کی وہ ہے کیچڑ پر سے پھسلنا (MUD SLIDING) کسی پہاڑی کی نرم گرم گہری ڈھلان ڈھونڈ ھ لی اور اس پر چکنی مٹی کا پلستر کر دیا تاکہ جسم پر خراشیں نہ آئیں اور نیچے پانی کا ننھا سا تالاب بنالیا۔ اب باری باری اوپر سے پھسلنا شروع کیا۔ جب تک نیچے پہنچے کیچڑ میں لت پت اور گدلے پانی کی ڈبکی میں اور مٹیالے بھوت بن گئے۔ کیا مزہ ہے!! چوٹیں لگیں، نیل پڑے، پھر بھی ہنس رہے ہیں اور تماشائی ان سے زیادہ لوٹ پوٹ!!

پھٹے حال ہونا ہر غریب ملک میں ایک معیوب مجبوری ہے لیکن امریکہ میں ایک ہر دلعزیز فیشن ہے۔ اچھے بھلے طلبا اپنے نئے لباس کو جگہ جگہ سے پھاڑ کر پیوند لگائیں گے۔ قدیم سے قدیم تر کار چلائیں گے۔ جتنی فالتو شے ہو، اتنے پیار سے ڈرائنگ روم میں سجائیں گے یہ بھی بھرے پیٹوں کے چونچلے ہیں۔ اور امریکہ کے تو کہنے ہی کیا ہیں۔ خدا نے سو سال سے فیض کے دریا بہا دیئے ہیں۔ ان کو اتنا دیا کہ یہ "دینے والے" کو بھول بیٹھے۔ جتنا کھانا ان کے ہوٹلوں میں ضائع ہوتا ہے۔ جتنا کھانا یہ پالتو جانوروں کو کھلا دیتے ہیں۔ اس سے ایشیا کے غریب پل سکتے ہیں۔ لیکن اللہ سے کون سوال کرے کہ امریکی کتے بلی کو ہندوستان یا کوریا کے کسان سے کیوں زیادہ خوش نصیب بنایا؟ علم اور معلّم کے لیے ہمارے معاشرے نے جو جگہ رکھی ہے۔ اس لحاظ سے پالتو جانوروں کے بعد ایک دم پروفیسر صاحبان کا خیال آیا (میں نے خود تیرہ سال یہ اعزاز حاصل کیا ہے) کہاں ہمارے ملک کے دریدہ حال سہمے ہوئے بوکھلائے ہوئے استاد جو دونوں ہاتھوں سے کبھی اپنی عزت سنبھالتے ہیں اور کبھی اپنی سائیکل، کہاں امریکہ کے پروفیسر جو ہفتے میں ایک لیکچر دے کر دو ہزار ڈالر (دس ہزار روپیہ سرکاری شرح سے) کما لیتے ہیں اور پھر بھی "کام زیادہ تنخواہ کم" کا واویلا مچاتے ہیں۔ خیر ہوائی میں پروفیسروں کے گھر دیکھے۔ گھر کیا حُسن سے بھرپور عیش کدے ہیں!! ہوائی کی پھیلی ہوئی سبز گھنی پہاڑیوں میں دُور دُور، جہاں کار بھی مشکل سے جائے۔ ان کے خانگی خواب آویزاں ہیں۔ ان ننھے ننھے شیش محلوں میں بیٹھ کر آپ ایک طرف بحرالکاہل کے آبی رنگ اور

رفتار سے محظوظ ہو سکتے ہیں۔ دوسری طرف ہوائی کا دوسرا رخ اس کے بدمست مگر شائستہ شجرستان
جہاں سانپ نہیں لیکن سانپ کی چھتریاں اگتی ہیں۔ جہاں کے پھول پتے توڑنے کو دل نہیں چاہتا،
کہ خود رد کائنات کا کوئی متبرک اصول نہ ٹوٹ جائے۔

شام ڈھلے عشائیہ پر یہ پُر مذاق نفیس نفیس پروفیسر مشعلیں روشن کرتے ہیں۔ لیکن ان کو دیکھنے
کا کس کے پاس وقت ہوتا ہے؟ نیچے وادی میں برقی قمقموں کے کارواں !! جنگل میں لاکھوں جگنوؤں
کے جشن اور اوپر آسمان پر بن بادل ستاروں کی بجلیاں کوندرہی ہوتی ہیں۔

بیٹھے بیٹھے اللہ میاں سے لڑ پڑی۔ لڑنے میں بہت طاق ہوں۔ لیکن صرف اللہ میاں
سے (انسان سے کیا لڑنا۔ کمزور پر زور آزمانا کہاں کی بہادری ہے) داورا! اس خطے کو سب ہی
کچھ دے ڈالا۔ ہمارے لیے کچھ تو چھوڑا ہوتا!

پروفیسر نہ صرف ہوائی کے بہت دلچسپ اور متواضع تھے بلکہ "اندرون" (MAIN
LAND) کے بھی کئی پروفیسر آئے ہوئے تھے جن سے بات کر کے ذہنی افق فراخی پاتے
تھے۔ ہوائی کے نیم چینی "ڈاکٹر لسی" ایک سیاسی شرارہ تھے۔ ان دنوں وہاں کی یونیورسٹی میں
ویت نام پر چوبیس گھنٹے بلا توقف مباحثہ ہوا۔ اس میں یہ پیش پیش تھے اور امریکہ کو کراری
کراری کھلی کھلی گالیاں دے رہے تھے۔ دو یہودی ڈاکٹروں (وہاں پر پروفیسر ڈاکٹر ہے اور ڈاکٹری
کا طب سے کوئی واسطہ نہیں) نے ہماری بہت خاطر کی۔ اپنے بیوی بچے موٹریں ہمارے حضور
میں حاضری کے لیے وقف کر دیں۔ کچھ دیر کے لیے ہم فلسطین کے عربوں کو بھول گئے (یہ تین
سال پرانی بات ہے) کیلے فورنیا یونیورسٹی کے معمر ستر سالہ سفید سر کے ڈاکٹر پال خاجن کی کتابیں
سوشیالوجی اور پبلک نظام میں نئی دریافتیں ہیں۔ بہت حلیم اور خندہ لب انسان تھے۔ ان کا گھر
یہاں تو جو تھا سو تھا۔ بعد میں کیلے فورنیا میں دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ یہ سب پروفیسر ان
امریکہ کی نسلی کھچڑی کی ایک مزید مثال تھے۔ آدھے جرمن تین چوتھائی لبانی۔ ایک تہائی برطانوی
۱/۵ ہسپانوی، ۱/۲ ڈچ غرضیکہ ان بوٹوں بوٹوں میں علم بٹا ہوا تھا۔ فی الحال تو یہ سب امریکن

تھے۔ ان میں زیادہ تر روشن خیال "لبرل" تھے۔ افسوس کہ ان کی مفلوج اقلیت امریکہ میں کوئی زبان کوئی آواز نہیں رکھتی۔ ان کے پاس ایک بھی اپنا روزنامہ اخبار نہیں۔ ایک "لبرل" ٹیلی ویژن یا ریڈیو کی "چینل" نہیں۔ وہ اکثر مجھے بتاتے تھے "کہ ہم خود اپنے ناخن چباتے ہیں اور بال نوچتے ہیں۔ لیکن ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ امریکہ کی خارجی پالیسی نہ صرف پوری قوم کی اخلاقی خودکشی ہے بلکہ باقی ساری دنیا کے لیے ایک ہیبت ناک خطرہ ہے۔ اگر ہم صرف اپنی تیل کمپنیوں اور سی آئی اے CIA کو باہر نہ بھیجیں تو امن قائم رہ سکتا ہے۔ یہ ڈاکٹر سمتھ نے سرخ منہ سے کہا: "کون سا انصاف: کون سی جمہوریت! ہم تو ایک فوجی امریّت ہیں۔" ان درخشاں ذہنوں سے مل کر روحانی خوشی ہوتی ہے۔ کاش کہ امریکہ کی لیڈرشپ پر یونیورسٹیوں کا کوئی اثر ہوتا! جب "کینزاز" (KANSAS) کی یونیورسٹی نے "ژان پول سارتر" کو لیکچر کے لیے مدعو کیا تو اس فرینچ مفکر نے آنے سے انکار کر دیا اور جواب دیا کہ تم اہل فکر امریکہ کا نامرد طبقہ ہو۔ جن کا سیاسی وزن یا اخلاقی اثر نہ ہونے کے برابر ہے۔"

ایک پروفیسر کا تعارف ذرا لمبا ہو جائے گا کیونکہ وہ خود سات فٹ ایک انچ کے تھے۔ ایک دن میں یونیورسٹی لائبریری میں کتابیں لے رہی تھی تو ایک معنک دیو قامت سر سے گنجے صاحب مجھے بغور دیکھ دیکھ کر مسکراتے رہے۔ مسکرانا ہوائی میں ایک فضائی عادت یا روحانی ورزش ہے۔ میں بھرونہ پڑی کرنے لگی۔ کارڈ پر لائبریرین نے کچھ بحث چھیڑ دی تو میں ذرا جز بز ہوئی تو پیچھے سے آواز آئی "بادشاہو تسی کیوں اوکھے ہوندے او"۔ پلٹ کر دیکھا تو یہ بدہیبت بلندی میرے قریب کھڑی تھی۔ مجھے پھر بھی یقین نہیں آیا کہ اتنا ڈاہڈا سوہنا پنجابی لہجہ اس سفید ستون نے ادا کیا ہے۔ یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ کچھ رسمی گفتگو ہوئی۔ لیکن مجھے ان صاحب کی پوری رام کہانی گاہے بگاہے ملاقاتوں میں خود ان سے معلوم ہوئی۔ نام "سوامی آگیا نندن بھارتی" تعارفی نام ڈاکٹر بھارتی۔ گوشت پوست "وی اینا"۔ کا۔ پاسپورٹ امریکی اس وقت امریکہ کی "سراکیوز" یونیورسٹی میں "اینتھروپولوجی" اور سوشیولوجی پر ماہر مانے جاتے

ہیں اور کئی کتابیں لکھ چکے ہیں. اس مغربی علم دان کا سوامی ہونے سے کیا مطلب ؟ جب یہ انیس سال کے تھے تو آسٹریا میں سبھاش چندر بوس اپنے سیاسی پرچارک اور فوجی مدد کے لیے آیا تو یہ اس کے PERSONAL ADJUTANT) ہو گئے اور اس کے ساتھ ساتھ رہے جب سبھاش سورگباش ہوئے ربیچارے کا ہوائی جہاز جاپان نے خفیہ طور پہ ٹورپیڈو کر دیا تھا) تو پروفیسر بھارتی نے ہندوستان پہ ورود کیا اور اس کی شمالی جنوبی وسعتوں میں دس سال خاک چھانی. راماکرشن مشن میں بھرتی ہو کر چیلے بنے، سر منڈایا. دن رات تپسیا کی. ہر گرو کی چلم بھری. ہر گرنتھ پڑھی. چار پوربی زبانیں پہلے سے آتی تھیں. ہندوستان کی چھ زبانیں اور سکھ لیں راس وقت ۵ ازبانیں بخوبی بولتے ہیں) اور محض تکلفاً نہیں بلکہ عملاً. ہندوستان کے تنوع اور معاشرے کو سمجھنے کے لیے بڑے شہروں سے گاؤں تک ہر مزدور کسان، ہر عورت اور بچے سے گفتگو کی اپنے ملک کے متعلق منہ کھولتے شرم آتی تھی. کم بخت ہر چیز جانتا تھا. ہر ذات کے شجرے. آم کی نسلی تاریخ. پان کی شاہانہ شاخیں. عورتوں کی ازدواجی شکایتیں "تمہارے ملک میں عورتوں کا حال تباہ ہے. میں دیس دیس، گاؤں گاؤں پھرا ہوں. عورت مجھ سے پہلی ہی ملاقات میں دل کے درد وا کر دیتی تھی. کیونکہ ایک تو میں زرد چولے میں گرد سمجھا جاتا تھا. دوسرے فرنگی تھا اور غیر قوم کے سامنے عورت اپنی تکالیف بے حجاب کرنے میں عار نہیں سمجھتی. یقین مانیئے مسز ریاض الدین آپ کی عورتوں کو ان کے خاوند جانوروں کی طرح برتتے ہیں. اپنے محدود تعلیم یافتہ امیر طبقے کو آپ ایک طرف رہنے دیں. میں صرف جاہل شہریوں اور اس کی اکثریت کی بات کرتا ہوں جو دیہات کے اُجڈ گنواروں پر مشتمل ہے. زیادہ تر عورتیں خاوندوں کی جنسی فرمائشوں کے ہاتھوں رو رہی ہیں. مرد صنف نازک کو جذباتی اور جسمانی طور پر آہستہ آہستہ تیار کرنا بالکل نہیں جانتے. ان کو اگر انگریزی کی کتابیں نہیں پڑھائی گئیں تو کم سے کم "کاماسوتر" کا پنجابی یا سندھی میں ترجمہ کر کے دیا جاتا. آپ کے ملک اور ہندوستان میں بہت کم عورتیں ایسی ہیں جو جنسی تعلقات سے لطف اندوز ہوں." میں چپ سنتی رہی. میں اپنے معاشرے پر باہر والوں کی نکتہ چینی سے کبھی

سچ پا نہیں ہوتی. حقیقت سے گریز کر کے تلملانا بہت مشکوک اور متروک قسم کی حُبّ الوطنی ہے جو پروفیسر بھارتی کہہ رہے تھے. زیادہ تر صحیح تھا نشتر میڈیکل ہسپتال اور میو ہسپتال کی عورتوں کے وارڈز میں ایڈز بھی دکھڑا سنا جاتا ہے. بہر حال پروفیسر بھارتی سے کئی ملاقاتیں ہوئیں. وہ ہمارے یہاں بن بلائے بھی آجاتے تھے. کیونکہ انہیں ہمارے پراٹھے اور چٹ پٹے کھانے بہت پسند تھے. باوجود سوامی ہونے کے وہ ہندوستان کو بہت کھری کھری سناتے تھے. ہندو طلباء نے ان کے اعزاز میں ایک خاص تقریب منعقد کی. بھارتی گرو تقریر کے لیے اٹھے. شروع ہی کے دو منٹ میں آپ نے میزبانوں کو ٹھنڈا کر دیا. فرمایا: "ہندو فلسفہ حیات گول مول روئی کے گالے ہیں، جنہیں مغربی مفکر گھر لے جاکر باریک باریک سوت میں کاتتے ہیں اور ٹیڑھے میڑھے جامے پہناتے ہیں." آگے چل کر سوامی جی بولے "تمہاری سیاست معاشرے کی طرح منافقت سے اٹی پڑی ہے اور پنڈت نہرو تو دانشورانہ دھوکہ INTELLECTUAL FRAUD تھا. ہندو طلباء اپنے پر لعنت بھیجیں کہ ہم نے اس بلا کو مدعو کیوں کیا؟

ڈاکٹر بھارتی آزاد خیال مفکر ہیں اور خاصے منہ پھٹ بھی. کسی کی پروا نہیں کرتے. خود شادی نہیں کی. برہمچاری ہیں. لیکن اوروں کی شادیاں کرانے کا بہت شوق ہے. امریکہ میں جو ہندو شادی ہوتی ہے بلائے جاتے ہیں اور اپنا چولا پہن کر اگنی کے سامنے اشلوک پڑھتے ہیں. اور دولہا دلہن کو پھیرے ڈلواتے ہیں. ہندوستان میں پھیرے کی رسم ایک نفسیاتی ضرورت ہے. غریب دلہا دلہن اتنے چکر کھاتے ہیں کہ ازدواجی زندگی کے چکروں کے عادی ہو جاتے ہیں

ڈاکٹر بھارتی آرتھر کوسلر کے جانی دوست ہیں اور آجکل دونوں کسی لائبریری میں تارک الدنیا ہو کر بدھ مت کے تانترک پہلوؤں پر دن رات تحقیق کر رہے ہیں.

ہوائی میں دو ہوٹل بہت انوکھے تھے. میں اپنے ہر پاکستانی مہمان کو وہاں زیارت کے لیے لے جاتی تھی. ایک تھا "اِلی کائی" جس کی لعنٹ مکمل گلاس کی تھی. جوں جوں اوپر جاتی سمندروں کا فیروزی فروغ نظر آتا. دوسرا ہوٹل "لارونڈ" (LA RONOE) تھا جس کی بالائی

منزل سراسر شیشے کی بنی ہوئی تھی اور اپنی سپرنگوں پر آہستہ آہستہ گھومتی رہتی تھی۔ جس منظر سے آپ سیر شروع کریں۔ گھنٹہ بھر میں چکر کاٹ کر دوبارہ سے اسی جگہ آپ کو لے آتی تھی۔

ایک اور جگہ میری محبوب پناہ تھی۔ وہ پالی کی بلندیاں (PALI HEIGHTS) اس کی دو خصوصیات تھیں۔ ایک تو بلند ترین پہاڑوں میں بالکل سیدھی سپاٹ ڈھلان تھی جو نشیب کی وادی میں جاکر رکتی تھی۔ دوسرے اس مقام پر ہوا اتنی تند ہوتی ہے کہ کاروں کے "ہڈ" بھی اڑ جاتے تھے اس میں دھان پان اصحاب تو ہوا ہو جائیں۔ میں شاید ہمت نہ کرتی۔ لیکن ہوائی میں کئی سیر وزن بڑھ چکا تھا۔ اس لیے خطرہ کم ہوگیا تھا۔ مجھے پہلے ہی سے آگاہی مل چکی تھی۔ کہ ساڑھی پہن کر مت جانا۔ جیسے کوٹ بالکل چھتری کی طرح پھول کر سر پر چھا جائے گا تو میں پہلی دفعہ ہوائی لباس "مومو" پہن کر گئی۔ لیکن بال کھلے ہوئے تھے۔ جونہی کار سے اتری میرے بال ہوا میں سیدھے ناگ کی طرح کھڑے ہو گئے۔ میری بیٹیاں ہنس ہنس کر پاگل ہوگئیں۔ میں بالکل بدہیئت کالی چنڈی ماتا لگ رہی ہوں گی۔ کئی سیاح اپنے کیمرے مجھ پر جمانے لگے۔ انہوں نے ہندوستان کا مشہور "رسی کا شعبدہ" (ROPE TRICK) سنا تھا۔ لیکن یہاں ایک ساڑھی والی اپنے بالوں کو ہوا میں الٹا معلق کئے ہوئے تھی۔ یہ بھی کوئی شعبدہ تھا! میں بھاگی لیکن بھاگوں کہاں؟ ہوا کا زور پیچھے پھینکتا ہے۔ بڑے مرد اپنے سروں پر وزن رکھ کر جانا چاہتے ہیں لیکن پھر بھی اس خاص رُخ پر ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکے۔ یہ تماشہ سارے وقت چلتا ہے اور دیکھنے میں مزہ آتا ہے۔

جزیرہ ہوائی والے صرف سفر کے جانتے ہیں خوف نہیں۔ لیکن ایک چیز کبھی کبھی ان کو دہلاتی ہے وہ ہے دیوزاد موج (TIDAL WAVE) جو شاذونادر بہت خاکساری سے دوسو میل دور روداں ہوتی ہے۔ راستے میں اپنی آغوش میں طوفانوں کو لپیٹتی ہوئی چالیس پچاس فٹ تک بلند ہوتی ہے اور چھوٹے موٹے جزائر غرق کرتی ہوئی ہوائی کے سات بڑے جزائر کے ساحلوں پر حملہ آور ہوتی ہے۔ دس سال ہوئے اس نے کئی گھر غرقاب کر دیئے۔ البتہ

بانی نقصان نہیں ہوا۔ کیونکہ امریکہ کا نظام بلکہ تمام مغرب کا طریق حکومت ایک بھی انسان کی جان کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ ایشیا میں تو انسان کتے بلیوں کی طرح مرتے رہتے ہیں۔ اخبار انکی رپورٹ کرنا بھول جاتے ہیں۔ کیونکہ کالم میونسپل الیکشن اور کرکٹ میچ سے بھرا ہوتا ہے۔ لیکن امریکہ انگلستان میں ایک سڑک پر ایک پلا بھی مرجائے تو تین دن تک اخبار تفتیش کرتے رہتے ہیں۔ خیر مجھے بڑا ارمان تھا کہ میرے سامنے یہ موج اٹھے۔ کچھ خوف بھی آتا تھا کہ آج بیچ اٹھ کھڑی ہوئی اور بجائے پچاس فٹ کے ستر فٹ چڑھ گئی تو ہم کہاں جائیں گے۔ آخر بحرالکاہل تو مشہور من موجی ہے جو موج میں آیا کیا۔ لیکن دل میں کرید بھی تھی کہ اسے دیکھوں۔ بہرحال چلنے سے دو ہفتے پہلے زرد کا سائرن بجا۔ ہم نے سوچا کہ جھوٹی آگاہی FALSE ALARM ہوگی۔ پھر بجا تو سوچا کہ فضائی ورزشیں ہو رہی ہیں۔ پھر ٹیلی فون بجا۔ ایک پروفیسر نے بہت آرام سے ہنس کر کہا کہ آپ ''وائی کیکی'' WAIKIKI ساحل چھوڑ کر اونچے مقام پر آجائیے۔ ایک خطرناک موج اٹھ رہی ہے۔ ریڈیو پر اعلان ہو رہا ہے۔ ہم نے شکریہ ادا کر کے فون بند کر دیا۔ دل دھڑ دھڑ لیکن کچھ خوشی بھی کہ تمنا پوری ہوئی۔ ریاض صاحب کو دفتر فون کیا کہ جلد گھر آؤ۔ میرے میاں کا اطمینان اس قدر نروانی قسم کا ہے کہ امید تھی کہ موج کے بعد گھر پہنچیں گے۔ اتنے میں ٹیلیویژن چلا دیا۔ شہر کے پس ماندہ علاقوں میں نا سما اضطراب تھا۔ لوگ گھر خالی کر رہے تھے۔ قیمتی چیزیں اٹھا اٹھا کر کاروں میں روانہ ہو رہے تھے۔ پولیس اور ملٹری پولیس نے بہت سے ساحلوں پر قبضہ کر لیا بعض سڑکوں پر سناٹا لوگ بہت جلد بھاگ گئے۔ ہر پانچ منٹ میں موج کا تازہ ترین حلیہ بیان کیا جاتا تھا۔ اب اتنی اونچی اتنی چوڑی اتنی تیز ہو گئی ہے۔ ہمارے پاس کوئی قیمتی چیز نہیں تھی۔ سوائے پاسپورٹ اور چیک بک کے وہ ہم نے اپنے بٹوے میں ڈال لیں۔ ہماری بیٹیاں ہم سے زیادہ خوش۔ خیر ہوتے ہواتے میاں بھی پہنچ گئے۔ وہ بچوں سے بھی زیادہ کھل رہے تھے۔ ہم بس کار میں بیٹھ گئے۔ میں نے کہا سارا علاقہ خالی ہو گیا ہے جلد کسی پروفیسر کے پہاڑی گھر میں پناہ لے لو۔ میاں بولے۔ ''واہ جلدی کیا ہے ذرا شہر کی گھما گھمی تو دیکھیں کہ لوگ کس طرح ڈرے ہوئے بھاگ رہے ہیں'' پھر

سائرن بجنے لگے۔ اعلان ہوا کہ یہ آخری آگاہی ہے۔ اس کے بعد ہم لوگوں کے ذمہ دار نہیں لیکن میاں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ انہوں نے کار کا رخ سب سے پرخطر علاقے کی طرف کیا۔ جب منچھ بازار پہنچے تو ملٹری پولیس نے وہ ڈانٹ پلائی کہ فوراً مراجعت فرمائی اور ہوائی کے سب سے بڑے اور خوبصورت ہسپتال میں آکر رکے۔ ایک دم میاں بیوی کو یاد آگیا کہ آج تو ہم دونوں کی تین بجے ڈاکٹر سے ملاقات ہونی ہے۔ چلو ایک پنتھ دو کاج۔ مریض کھڑکیوں کے پاس بیٹھے موج کا انتظار کر رہے تھے کیونکہ یہ ہسپتال دس منزلہ تھا۔ اس لیے کوئی ڈر نہیں تھا۔ ڈاکٹروں نے ہم دونوں کو اطمینان سے دیکھا، رسمی مذاق کئے۔ ہم باہر آگئے تو اعلان ہوا کہ اس مہیب موج نے آدھے راستے میں دم توڑ دیا۔ لوگ گھروں کو واپس جائیں۔ ایک عظیم ڈرامے کا "اینٹی کلائی میکس" "ANTI CLIMAX" یہ ہوتا ہے!! سخت کوفت ہوئی! کھسیانے نا امید گھر واپس آئے اپنے پاسپورٹ چیک بک، پھر دراز میں رکھے۔ میاں بستر پر دراز اور بچے شام کی پکنک کی تیاری کے لیے میری خوشامد کرنے لگے کہ دہی بڑے بناؤں اور مجھے اس بات کا غم اور غصہ کہ یہ موج کہاں مر رہی۔ ایک دفعہ تو نامراد کو اٹھتے دیکھتی۔

حال ہی میں ایک جگہ مجھ سے فرمائش ہوئی کہ ہوائی کے لباس کے متعلق بتاؤں۔ تو صاحب ہوائی کا "ازلی لباس" تو تھا گندمی جلد۔ آہستہ آہستہ عورتوں پر جب حیا غالب آئی تو انہوں نے گھاس کی گھگھریاں کمر پر لٹکا لیں اور سینے پر پھولوں کے ہار ڈال لیے۔ جب عیسائی مبلغ امریکہ سے آئے تو ان کی شائستہ خواتین یہ برہنگی دیکھ کر بہت برہم ہوئیں اور پچکار پچکار کر ان آزاد ہرنیوں کو معاشرت کے لبادوں میں دھکیلنے لگیں۔ یہ لباس بغیر کسی کاٹ کے ایک چولا ہوتا تھا MOTHER HUBBARD اس چولے نے بتدریج ترقی پائی۔ کہیں پھندنا لگا، کہیں پٹی، کہیں آستین، کہیں چُنٹ، کہیں کاٹ۔ لیکن پھر بھی آج چولا کا چولا ہے اور صرف سیاحوں کی خوشی کے لیے ہزاروں کی تعداد میں بکتا ہے اور مومو MOOMU کہلاتا ہے۔ مرد اس لباس کو اس لیے پسند نہیں کرتے کہ اس میں "جنسیت" عنقا ہے۔ عورت کا جسم بہت

کم نظر آتا ہے۔ ایک لحاظ سے یہ ہمارے لیے شرعی لباس ہو سکتا ہے۔ عورتوں کو اس لیے پسند ہے کہ اوّل تو حسین رنگوں میں ملتا ہے۔ دوسرے اس کے نیچے نہ جانگیئے کی ضرورت نہ پیٹی کوٹ کی۔ صبح سے رات تک پہنے رہو۔ اسی میں سو جاؤ۔ اسی میں رقص کر لو۔ ہوائی میں یہ لباس ہر جگہ چلتا ہے۔ اس پر بال کھلے ہوں تو سونے پر سہاگہ۔ اس لیے لڑکیاں اس مُومُو کی خاطر بال بھی لمبے کر لیتی ہیں یا مصنوعی چٹیاں لگا لیتی ہیں۔ اب یہ "مومو" ساری دنیا میں ہر دلعزیز ہوتا جا رہا ہے۔ حد ہے کہ اب کراچی میں بھی بکنے لگا ہے۔ میں بھی ایک عدد مومولائی ہوں اور جب ہوائی کی یاد ستاتی ہے اس کو پہن لیتی ہوں۔ یہ پہلا مغربی لباس ہے جس پر میاں نے ناک بھوں نہیں چڑھائی۔

لیکن وقت کی ستم ظریفی پہ ہنسی آتی ہے۔ جن عیسائیوں نے برہنگی پر واویلا کیا تھا اور یہ چولا ایجاد کیا تھا۔ انہی عیسائیوں کی موجودہ نسل تقریباً برہنہ "ٹو پیس" اور "ٹوپ لیس" میں ساحلوں پر لیٹی ہوئی ہے۔ گھاس کی گھگھریاں تو کم سے کم گھٹنوں تک آتی تھیں۔ اب تو جسم کا کوئی حصہ پوشیدہ نہیں "بکنی BIKINI" تو محض ایک قانون اور معاشرے کے لیے دھوکا ہے اس کی بھی کیا ضرورت ہے!

ہوائی کا قصہ نامکمل رہ جائے گا۔ جب تک اس کے پھل اور پھول کا ذکر نہ کیا جائے۔ ہوائی میں ہر وہ پھول اُگتا ہے یا اُگ سکتا ہے جو ہمارے یہاں اُگتا ہے۔ اس کے علاوہ مغربی ممالک کے بیشتر پھول بھی وہاں اگائے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ وادیاں نیم گرم اور پہاڑ یاں نیم سرد۔ اس لیے سارے سال دنیا جہان کے پھول لے لیجیے۔ لمبی تفصیل بے معنی ہے۔ مجھے تو جن سے خصوصی عشق تھا وہ یہ تھے۔ اپنی طرف کی چنبیلی اور موتیا دیکھ کر دل خوش ہوا۔ اس کو ہوائی میں "پکاکی PIKAK" کہتے ہیں۔ اس کا عطر بھی اسی کے نام سے خوب بکتا ہے۔ ان پھولوں میں مہک بھی تھی۔ ورنہ مغرب کے پھولوں میں حسن ہے خوشبو نہیں جگہ جگہ باڑیں کی باڑیں "رکامنی" کی لگی ہوئی تھیں۔ وہ شام سے اس طرح پھولتی تھی کہ سر کو چڑھ جاتی تھی۔ مہندی کی بھی کئی کئی باڑیں تھیں۔ جن کی عروسی خوشبو سے ہوا بھاری ہو گئی تھی۔ عورتیں جُوہی

ہار سنگھار اور گُل شبو کے دو دو گز لمبے سانپ گلے میں ڈالے چہل قدمی پر نکلتی تھیں. اور قریب سے نکل جاتیں تو لمبے لمبے سانس لینے پڑتے تھے. ایک اور ظالم پھول ٹہیٹی جزائر کا "گارڈینیا" تھا۔ اس کی صرف دو جھاڑیاں ہمارے سنٹر کے حسین باغ میں فضا پر چھا جاتی تھیں. اور گھنٹوں ان کی مہک سر میں سمائی رہتی تھی.

لیکن ہوائی کے مخصوص پھول کچھ اور تھے. سب سے سوشل پھول "پلومیریا" PLUMERIA ہمارے یہاں "فرانجاپانی" کہتے ہیں. اس کے گجرے ہر تقریب پر پہنے جاتے تھے. گجرے میں نے دہلی لکھنؤ کے بھی دیکھے اور بمبئی کے بھی. لیکن ہوائی کے گجروں کا مقابلہ نہیں. یہ کم بخت امیر قوم کے پھول ائر کنڈیشنڈ کمروں میں رہتے ہیں اور تازگی یہ کہ جب گجرے خریدو تو معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ڈالیوں پر سے ٹوٹ کر آئے ہیں. کوبرا سانپ کی طرح چار پانچ انچ موٹے اور گز بھر لمبے. اس جسامت کے ہار کبھی نہیں دیکھے. یہ سب پھولوں کی افراط کی بات ہے جو جزائر ساری دنیا کو پھول برآمد کریں ان کے گجرے اس ناپ کے ہی ہوں گے. کم بخت "کارنیشن" کے ہمارے یہاں دو چار گملے مشکل سے سال بھر کی محنت کے بعد پھولتے ہیں. وہاں اسی پھول کے موٹے موٹے ڈسنے والے گجرے ناگن کی طرح لہلہاتے تھے. صرف مجھے ان کی لونگ جیسی تیز بو پسند نہیں. ایک پھول پیپل کے پتے کی شکل بالکل عنابی ساٹن کا بنا ہوا ہے. چھو کر بھی دیکھو تو یہی معلوم ہوتا ہے مصنوعی ہے ۔ اس سرخ پتے پر زرد رنگ کا مکوڑا بیٹھا ہے جو اس کے نقش و نگار کا ایک حصہ ہے۔ یہ سچ مچ مکوڑا نہیں ہے۔ اسے "اینتھوریم" ANTHURIUM کہتے ہیں اور یہ پھول ہفتوں نہیں مرجھاتا لیکن خاصا مہنگا ہے. پانچ روپے کے صرف دو ملتے ہیں. اس جزیرے کی اصلی جان "فردوسی پرند" BIRD OF PARADISE ہے جو جگہ جگہ اُگ رہا ہے. یہ پھول سچ مچ بہشتی پرند کی طرح اس طرح ہوا میں معلق ہے کہ گویا ابھی پرواز کا ارادہ رکھتا ہے. اس کے پر نیلے، پیٹ نارنجی اور چونچ ہری. دور دور اس کے جھنڈ اس طرح معلوم ہوتے ہیں جیسے فاختاؤں کے غول.

اس کے علاوہ جاپان کا "ازیلیا" بھی ہے اور جنوبی ایشیا کا ہر شگوفہ ORCHID نظر آتا

ہے۔ ہوائی کے پبلک باغات کے علاوہ پرائیویٹ باغات ہیں۔ یہاں پر خاص خاص سیاحوں کو مقررہ دن پر جانے کی اجازت ملتی ہے۔ انسان آب و گل کے کرشمے دیکھتا ہے اور صناعِ قدرت پر عاشق ہو جاتا ہے۔ ایک نئی چیز دیکھی وہ "چوبی گلاب WOOD ROSE ہے۔ یہ کرونڈے کی بیلوں کی طرح دیوار یا درخت پر چڑھ جاتا ہے اور اس میں ہرے ہرے ڈوڈے لگتے ہیں۔ جب وہ چٹخ کر پھوٹتے ہیں تو گلاب بن جاتے ہیں۔ پھر چند گھنٹوں کے اندر بالکل لکڑی کی طرح براؤن اور سخت ہو جاتے ہیں اور یہ چوبی گلاب ساری عمر نہیں مرجھاتے۔ سیاح انہیں بھی سنبھال سنبھال کر اپنے ملکوں میں لے جاتے ہیں۔ میں تو اس کے بیج بھی لائی تھی۔ لیکن کم بخت اُگے ہی نہیں۔

تھوہر CACTUS کی اقسام سے مجھے شغف رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو میری ساس اس کی شوقین ہیں اور ایک دفعہ مجھے ان کی تیس انواع بطور تحفہ دے گئی تھیں دوسرے یہ کہ ہمارے ملک میں ان موسموں، جب کوئی پھول سر نہیں اٹھاتا۔ یہی سخت جان گملوں میں سجے ساری کمی پوری کرتے ہیں۔ ایک دن میرے والد بولے "صاحبزادی" جہنم میں بھی یہی کھانے کو ملیں گے"، میں نے سوچا چلو رہیر سل ہی سہی۔ خیر تو تھوہر کی انواع بھی ہوائی میں خوب ہیں۔ ایک قسم لاطینی امریکہ سے سمگل ہو کر آتی ہے۔ اس کو "سیریس" NIGHT BLOOMING CEREUS کہتے ہیں۔ اور وہاں کے مشہور "پوناہو" اسکول میں اس کی باڑ لگی ہوئی ہے۔ اس پھول کی خصوصیت ہے کہ چاندنی رات میں کٹورے کی طرح کھلتا ہے اور صبح ہوتے ہی مرجھا جاتا ہے کانٹوں میں اتنا نازک اور نفیس پھول کبھی نہیں دیکھا اور اس میں خفیف سی مہک بھی ہے میں شام کو جا کر دو پھول چرا لائی اور اپنے ہال میں سجا دیئے۔ رات کو خیال آیا کہ صبح ہوتے ہی بیچارے مرجائیں گے۔ کیوں نہ ان کو سورج کی روشنی سے پردہ کرایا جائے۔ میں نے انہیں "فرج" میں رکھ دیا۔ سارا دن وہ مزے میں رہے اور سورج غروب ہونے پر پھر میں نے نکال کر سجا دیئے۔ اس طرح میں نے پانچ دن ان کو زندہ رکھا اور فطرت کو دھوکا دیا۔ درختوں کی یہ کیفیت کہ چپے چپے پر کوئی نہ کوئی بہ۔س دے رہا ہے۔ کھجور اور پام کی درجنوں انواع۔ سرو۔ چیڑھ، املتاس کے زرد

فانوس پر ردئے زمین آویزاں. گل مہر کے درخت سارے سال آتش فروغاں، پیپل (بودھی کا درخت) ناریل. کیلا. ایک درخت "شاور" (SHOWERTREE) کہلاتا ہے تربوزی رنگ کے پھولوں سے لدا ہُوا. پتے کم پھول زیادہ. اس کا چھتر اس طرح چھایا ہوا ہوتا ہے کہ دُور دُور تک سائے کی ضرورت نہیں۔ املی کے کمرخ کے درخت دیکھ کر دہلی کا قدسیہ باغ یاد آگیا۔

اب پھلوں کی سنیئے. اچھا ذرا پہلے سبزی پر دو بول پڑھ لوں. بھنڈی چھ انچ کی. کریلے بلا مبالغہ دس دس انچ کے. ہمارے ملک کا ہر مسالہ یہاں بکتا ہے (صرف چاندی کے ورق نہیں ملتے) ان کے قومی پھل تو انناس، پپیتا اور گنا ہیں جس سے وہ پیسہ کماتے ہیں. انناس کے کھیت کے کھیت ہیں اور کار روک کر آپ کسی "بوتھ BOOTH" پر تازہ انناس مانگیے. اسی وقت چھیل کر مل جاتا ہے. چینی کی بھی ضرورت نہیں. پپیتے سائز میں چھوٹے. بیج ندارد اور نہایت رسیلے. پپیتوں کا یہ راز ہوائی کی حکومت کسی کو بتانا نہیں چاہتی. باقی دنیا جہاں کا پھل لے لیجیے وہ پھیکا اور امریکہ کا محبوب پھل AVACADO بھی ملتا ہے. جس پھل کی ہمیں خوشی ہوئی وہ آم تھا ہمارے ملک میں آم پھلوں کا بادشاہ سمجھا جاتا ہے لیکن ہوائی میں یہ ہر کوچے سے بے آبرو ہو کر نکالا جاتا ہے. اس غریب کی اتنی ذلت ہوتی ہے کہ شام کو بھنگی سڑکیں صاف کر کے آم گڑھ میں ڈال دیتے ہیں اور درخت پھر بھی لدے کے لدے. وہاں یہ پھل کوئی نہیں کھاتا. سوائے ہم جنگلیوں کے لیکن آم میں اپنے دیس جیسی مٹھاس اور خوشبو نہیں. لیکن پھر بھی آم تھا. ہم نے خوب کھایا. یونیورسٹی میں دُور دُور آم کے درخت روشوں پر سایہ فگن تھے اور ہم نے ہمیشہ مفت کھائے. لیکن یہی آم "سوپر مارکیٹ" میں تین روپے سیر بکتا تھا. یہ عجیب بات تھی. غالباً سڑکوں پر مفت اٹھولنے اور دُکان تک لا کر سجانے کی یہ قیمت تھی. لاہور سے ابا کا خط آیا کہ آم کا جشن من رہا ہے تمہارے بغیر سردلی حلق میں پھنس رہے ہیں." ہم پڑھ کر بہت ہنسے.

آم سے علی اکبر یاد آیا. حالانکہ دونوں میں کوئی تعلق نہیں. ہمیشہ ریڈیو پر اس فنکار کا سرود سنا. لیکن آمنا سامنا ہُوا تو ہوائی میں. ان کے شاندار "اوڈی ٹوریم" اور یونیورسٹی میں کئی دن پہلے

سے سب ٹکٹ ختم ہو گئے۔ اسی شام جب کرسیاں بھی بھر گئیں، تو لوگ سامنے فرش پر بیٹھ گئے۔ پیچھے دروازوں میں ٹھٹ کے ٹھٹ کھڑے ہو گئے۔ ہمارے ملک میں جب مغربی موسیقی کا ماہر آتا ہے تو سامنے کی چار قطاریں پُر کرنی مشکل ہو جاتی ہیں۔ خیر بدقسمتی سے علی اکبر کا ہوائی جہاز جو صبح آنا تھا شام کو پہنچا۔ یقیناً "بی۔ او۔ اے۔ سی" ہوگا اور غریب استاد ہوائی اڈے سے سیدھا محفل میں لایا گیا۔ نہ سرد موسم سے مانوس ہوا۔ نہ استاد کا مزاج۔ پہلا راگ چندرا نندن کچھ جچا نہیں۔ یہ علی اکبر کی اپنی اختراع ہے اور کئی راگوں کی کھچڑی۔ اور کھچڑی ہم کبھی نہیں چھوتے جب تک بیمار نہ ہوں۔ خیر طبلچی۔ گوپال اپنی جگہ بگڑا ہوا بیٹھا تھا کہ تعارفیہ تقریر میں اس کا ذکر نہیں آیا دوسرے راگ سندھی بھیرویں میں سے اس نے اپنے داؤ دکھانے شروع کیے اور اس قسم کی شعبدہ بازیاں کیں جس سے مغربی سامعین خوش ہوں۔ یہ موصوف علی اکبر پر چھا کر اپنی برتری دکھانا چاہتے تھے۔ لیکن استاد پھر استاد ہے۔ علی اکبر نے سندھی بھیرویں بجاتے بجاتے مغربی دھن GREEN LEAVES کا ٹکڑا ملا دیا اور شری گوپال چکر میں آ گئے کہ یہ کونسا راگ ہے۔ ادھر سامعین پھڑک اٹھے۔ اپنے مانوس سروں پر تالیاں بجانے لگے۔ غریب گوپال بہت کچا ہوا اور کان کھجانے لگا۔ پھر ہم نے اگلے روز اطمینان سے چھوٹی سی محفل میں صبح تین بجے تک سرود کا سرور اٹھایا۔ استاد بھی مست تھا۔ سامنے "وسکی" کا گلاس تھا۔ بجاتے بجاتے جب انگلی زخمی ہو گئی اور ذرا سا خون نکلا تو آپ نے وسکی میں انگلی ڈبو کر پھر بجانا شروع کر دیا اور اسی جام کو چکھتے بھی رہے۔

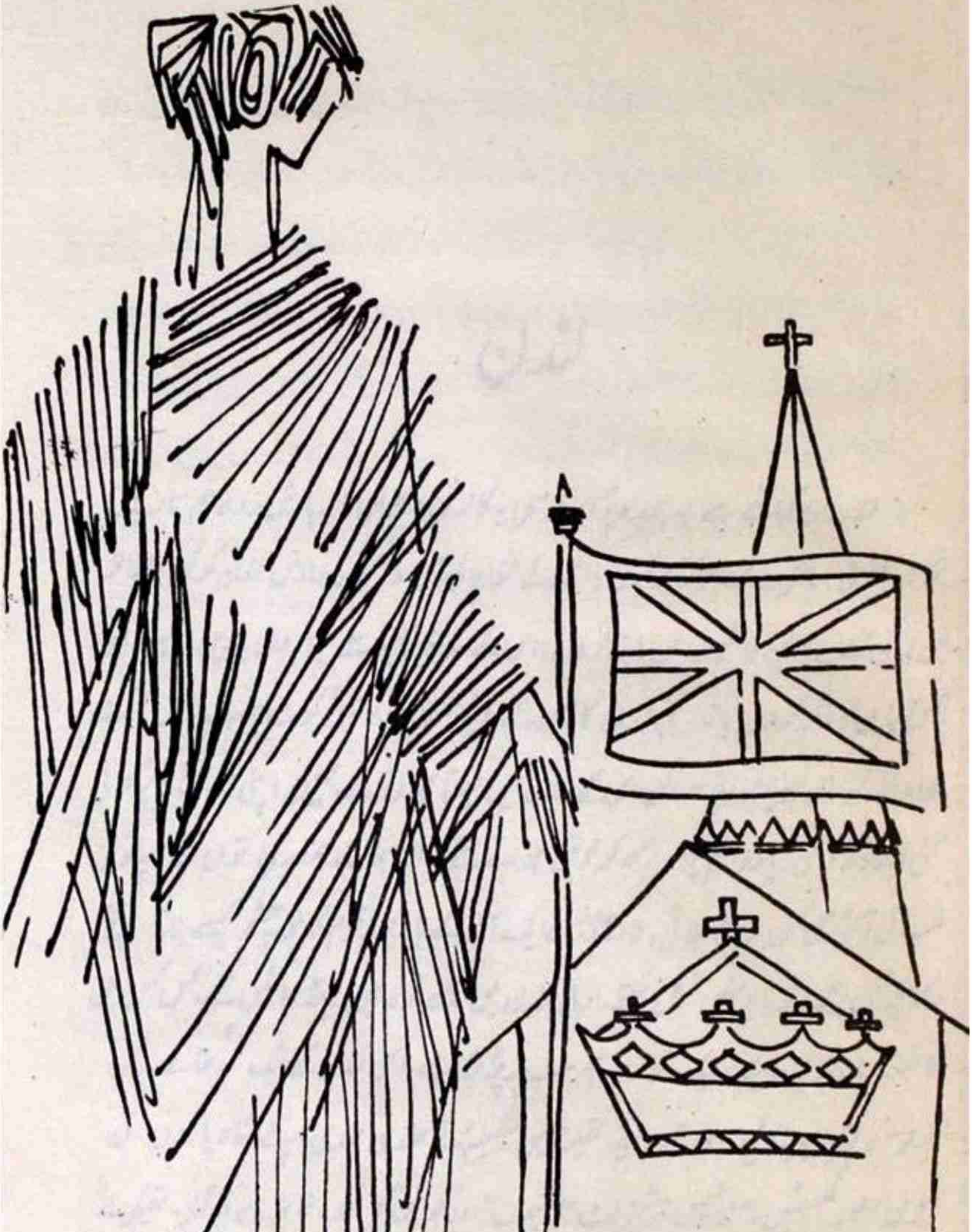
آخر میں ہوائی کی ایک دلچسپ سیرگاہ کا اور ذکر کردوں گی۔ پھر بس۔ وہ ہے ان کا "پولی نیزی ثقافت کا مرکز" POLYNESIAN CULTURE CENTER یہ ادارہ "مورمن" چرچ چلا رہا ہے۔ مورمن بھی عیسائیت کے عجیب پُراسرار بازو ہیں۔ پچھلی صدی کے آخر میں ایک امریکی شخص پر "وحی" اتری کہ وہ مذہب کی اصلاح کرے۔ ایک نیا دین "کتاب" بغیر کسی طرح مکمل نہیں ہو سکتا، تو غریب نے کتاب لکھی اور تبلیغ بھی کی۔ دیکھتے دیکھتے ہزاروں نے بیعت کی۔ آج مورمن چرچ بہت امیر اور وافر وسائل کا مالک ہے۔ اس کی شرع سے

سگریٹ، شراب نوشی، اور سود خوری منع ہے۔ سادگی پر زور ہے۔ رسومات کو نہیں مانتے۔ قبر پرستی سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کو "امریکی وہابی" کہا جا سکتا ہے۔ یہ پہلا مذہبی گروہ ہے جس کے ضمیر نے ملامت کی کہ ہوائی کے اصل باشندگان "سفید بے اعتنائی اور بے رحمی" کے باعث مٹ گئے ہیں۔ اس لیے کم سے کم ان کی روح کو ثواب پہنچایا جائے تو مورمنی گرجا نے لاکھوں ڈالر دے کر زمین خریدی اور اس میں "پولی نیزی" بڑی بوٹی کی پانچ نمایاں قوموں کے چند بچے کھچے افراد مثلاً نیوزی لینڈ کے "ماوری" MORIS ٹونگا لینڈ کے "ٹونگن" TONGANS ٹہیٹی کے باشندے "سموآ" کے باسی SAMOANS اور ہوائین اپنے اصلی پس منظر یعنی گاؤں اور جھونپڑیوں میں آباد کیے۔ یہاں یہ باشندے اپنی دیرینہ دستکاریاں بناتے ہیں اور رقص و سرود سے آنے والوں کو محظوظ کرتے ہیں۔ یہ سارا علاقہ بہت خوشنما نہروں اور تختوں میں آباد ہے داخل ہونے کا کوئی ٹکٹ نہیں۔ اگر کیمرہ آپ کی گردن میں ہے "کوڈیک" زندہ باد!!) ورنہ ٹکٹ ایک ڈالر ہے۔ البتہ رات کو اگر رنگین روشنیوں میں وہی ناچ دیکھیں اور کھانا کھائیں تو ٹکٹ پندرہ ڈالر۔ ویسے تو یہ گاؤں معلومات و تفریحات کا مرکز تھا۔ لیکن مجھے وہاں جا کر چنداں فرحت نہیں ہوئی۔ پولی نیزی کبھی کا مرمٹ گیا۔ اس کی ہڈیاں بھی پس گئیں۔ اب اس قسم کے جادو گھر میں اس کی روح کو واپس بلانا احمقانہ تمسخر تھا۔ لیکن سیاحوں کو خدا سلامت رکھے۔ ان کے روپے سے مورمن گرجا کی جیبیں بھر رہی ہیں اور ان کی تبلیغ اور وسیع ہو رہی ہے

لیکن سارے مبلغ ایک طرف اور ہوائی کی گلگوں وادیاں دوسری طرف مشنریوں سے زیادہ تو یہ کاشانی جمال انسان کو خدا کے قریب تر لاتا ہے

یہ جزائر صنعت تضاد کا عجب مظاہرہ ہیں۔ آب و آتش کی باہمی بقا اگر نہ دیکھی ہو تو یہاں دیکھیے۔ ان کی کوکھ میں نیم جاں جوالا اب بھی انگارے دہکا رہی ہے۔ ان کے سرہانے لازوال پانی افق کے دونوں کانی کناروں سے ہم آغوش ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم! کہاں چرخ نیلمیں ختم ہوا! اور کہاں یہ نیل شروع ہوا! یوں محسوس ہوا کہ گویا آب اور آسمان نے اپنی حدود کے

ہتھیار ڈال کر ایک مشترکہ نظامِ حُسن کا اعلان کر دیا ہے۔ یہ خدائی وعدے کی پہلی جھلک ہے
باقی بالائی جنت فرشتوں کو مبارک، ہم تو اسی پر خوش تھے۔ واللہ اعلم پچھلے جنم میں کیا نیکیاں
کی تھیں کہ قدرت نے یہ نیلگوں زندان ہمیں عطا کیا۔



لندن

لندن

لندن! یہ کیا شے ہے. یہ پیچیدہ پُر اسرار سحر! یہ کالونسی دھواں مارا. بارش زدہ نیم تاریک شہر! یہ مغربی معاشرت کا دھڑکتا ہوا دل! اس کے فنون کی آن و عصمت! اس لندن کو کن الفاظ میں بیان کروں؟ کن حاشیوں میں پابند کروں! اس کے ساتھ بچپن سے ہزاروں یادیں وابستہ ہیں کس لندن کا ذکر کروں؟ تاریخی لندن کا جس کے پایۂ سلطنت کو پیٹی کوٹ بہت راس آتا ہے خواہ ملکہ کنواری ہو یا بیوہ یا سہاگن اس کے سائے میں پھلتا پھولتا ہے. ہمیں اپنی تاریخ کم پڑھائی گئی اور برطانوی زیادہ. ہم پڑھ پڑھ کر خوش ہوتے تھے کہ الزبتھ کے سمندری کتوں نے ہسپانوی فلپ کی ڈاڑھی کس طرح جلائی. لارڈ ڈینس ایک آنکھ کے باوجود قوم کا نورِ چشم کیسے بنا. تاریخ کے چکر میں پڑے تو باہر نہیں نکل سکتے. ادبی لندن میں گھسے تو وہیں بیٹھ جائیں گے. کس کس جن کا قصہ بیان کریں. ایک ایک کا سایہ ہم سب پر پڑ چکا ہے. اسی لندن کے ایک خُم خانے میں "مارلو" کو چھرا بھونکا گیا. اس کے مرمیڈ تھیٹر میں شیکسپیئر نے جلدی جلدی اپنے شاہ پاروں کی آخری سطور گھسیٹیں. "ایڈیسن"، "ہیزلٹ"، "لیمب" اور "جونسن" کا قہوہ خانہ. یہ "ڈکنز. تھیکرے" گالزوردی اور "برنارڈ شو" کی تخلیق کا مواد. برافروختہ نوجوانوں کا محرک! یہ لندن دنیا کے باغی اور زندہ ذہنوں کی جائے پناہ. یہاں کارل مارکس نے اپنا فلسفہ دیکھا. "والٹیر" نے اپنے اشتعال انگیز صفحے چھپوائے.

اس کی یونیورسٹیوں کی آزاد فضاؤں سے ہر ملک کے آتش نفس جوان، انسانیت، مساوات

اور انصاف کی آگ لے کر واپس گئے اور اپنے وطن میں جاکر خود برطانوی راج کے خلاف مشعل بن کر نکلے۔ یہ لندن غیر نوشتہ آئین کا علمبردار۔ یونان کے بعد دنیا کی سب سے پرانی شہری آزادی کی حمایت۔ موجودہ زمانے کی سب سے نیک نیت اور مسلسل جمہوریت!

تو صاحب کس لندن کی بات کریں؟ وہ جان بُل یا کرنل بلمپ کا نشان۔ سامراجی عہد پہ نازاں و درخشاں لندن۔ بین الاقوامی تجارت اور سیاست و ضیافت کا مرکز۔ یا پچھلی جنگ عظیم کا بم زدہ" چرچل افروختہ۔ نیم راشنی" لندن۔ یا اپنی راکھ سے دوبارہ زندہ لندن یا آج کا افراط زدہ لندن۔ بیٹ نک۔ موڈ راکٹ ہیپ کا گھوارہ! 'یورپ' امریکہ کے طرزِ فیشن کی پہلی چال! سستے ڈاکٹروں اور سستے سویٹروں کا بازار! اعلیٰ تھیٹر اور اعلیٰ کتب خانوں کا آخری معیار! آزاد صحافت اور شائستہ بی۔ بی۔ سی کا لندن!" لیبر" حکومت کے اصولوں کا نیلام لندن، قلم رُکتا نہیں جذبات تھمتے نہیں۔ اگر کبھی جلاوطن ہوئی تو بسوں گی لندن میں۔ ہاتھی مرکے بھی سوا لاکھ ٹکے کا ہے۔

برطانوی سورج غروب ہوگیا۔ سامراج سمٹ کر مشترکہ دولت بن گیا اور اس دولت میں بھی پھوٹ رہی ہے۔ ممالک رسے تڑا رہے ہیں۔ پھر بھی لندن انسان ہے۔ گرم جوش ہے۔ مہذب ہے محفوظ ہے۔ نہ سہی نیویارک کی بتیاں اور بلندیاں نہ سہی پیرس۔ روم۔ لینن گراڈ کی بجلیاں۔ لیکن پھر بھی جب اس کے پارکوں میں گھومتے ہیں۔ جب اس کے ٹیکسی ڈرائیوروں، بس کنڈکٹروں سے واسطہ پڑتا ہے۔ جب اس کے "کوکنی" COCKNEY سے اجودّی کے کرخندار سے کم نہیں!" پیٹی کوٹ لین" میں سودے چکاتے ہیں۔ جب اس کی آرٹ گیلریوں اور عجائب خانوں میں گھنٹوں قدامت سے متعارف ہوتے ہیں۔ اس کے پروفیسروں اور دانشوروں سے ہمکلام ہوتے ہیں تو ایک ایسا لطف آتا ہے جو اور کہیں نہیں۔ شاید زبان فہمی اس کی وجہ ہو لیکن امریکہ میں بھی تو انگریزی ہے۔

میری لندن سے ملاقات صرف تین بار ہوئی۔ پہلی دفعہ محض ایک سیاح کی حیثیت

سے، دوسری دفعہ ایک مانوس شہری کی مانند اور آخری بار ایک عاشقِ دیرینہ کی طرح. پہلی دفعہ گیارہ سال ہوئے لندن صرف آٹھ دن ٹھہری. وقت کم، پیسے کم، جنون تماشہ وہ کہ کمرے میں تلوا نہ ٹکنے دے. اتفاق سے میرا تین چوتھائی سسرال بھی اسی زمانے میں کسی نہ کسی بہانے لندن آ ٹپکا. انیس افراد نے مل کر پوری منزل کے کمرے بُک کر لیے. صبح ڈیڑھ سیر قیمہ مرچ ایک جٹھانی پکاتی تھی اور رات کو مرغ شوربا دیورانی. مجھ سے یہ اصرار تھا کہ میں بھی اگر پیاز نہ کاٹ سکوں تو کم سے کم یہ دیگ ضرور چکھوں. میں نے کہا. ہزار لعنت سیاحت پر اور لندن پر، اگر میں چولہے کے پاس جاؤں. جب پانچ شلنگ میں مزے سے ریستوران میں کھا سکتے ہیں (وہ زمانہ بہت سستا تھا)، تو میں کیوں چرائندہ قیمہ ڈبل روٹی سے کھاؤں. میں نے تین دلچسپ ہم سفر تلاش کر کے کرائے پر موٹر لے لی اور لندن گائیڈ بُک کے صفحے الٹ الٹ کر دیکھا. وہی جو سب دیکھتے ہیں. ٹاور آف لندن کا کوہ نور اور ہنری ہشتم کی جلادی کلہاڑی جس سے ہر چہیتی ملکہ کا سر اتارا جاتا تھا. غٹرغوں کرتا "ٹرافیل گر سکوائر" TRAFALGAR SQUARE سینٹ پال گرجا جو سر راہ مصوّروں کے لیے زیادہ مشہور ہے. غرضیکہ سمندری شہزادی کی ہر کروٹ، ہر انگڑائی دیکھ ڈالی. اب کیا کریں؟ تھیٹر؟ بدقسمتی سے شیکسپئر کا گم نام اور لغو ترین ڈرامہ "ٹائٹس اینڈرونی کس" TITUS AND RONICS چل رہا تھا لیکن چونکہ "لارنس آلیور" اور ان کی مہ لقا منکوحہ VIVIEN LEIGH حصّہ لے رہے تھے. ہم سوا پاؤنڈ (حرام میں) فی کس خرچ کر کے پہنچ گئے.

میری توبہ!! شروع سے قتل و غارت، آہ و بکا، جرائم و مظالم. آخری سین میں سوائے لاشوں کے اور ہمارے کوئی ہال میں نہیں تھا. شوق ہو تو ایسا ہو. سب مجھ پر اور میرے "شیخ پیر" پر لعن طعن کر رہے تھے اور مجھ سے پیسے واپس مانگ رہے تھے. اس سفر کا ایک لطیفہ مجھے کبھی نہیں بھولے گا. لندن سستے کپڑوں کے لیے مشہور ہے. ہم بازار میں سیر کر رہے تھے. ایک دکان کے شوکیس میں ایک عمدہ سوٹ لٹکا دکھائی دیا. پرچی لگی ہوئی تھی "سوا پانڈ" میرے

میاں بیتابی سے میرا بازو پکڑ کر دکان میں جا گھسے۔ جب سوٹ مانگا تو مینجر بولا۔ "یہ تو ڈرائی کلینر کی دکان ہے۔"

دوسری بار ریاض صاحب کو امپیریل ڈیفنس کالج کے کورس پر بھیجا گیا۔ میرے میاں صلح پسندی میں گاندھی صغیر کہلاتے ہیں۔ اس لیے ان کا دفاع جیسے موضوع سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن ہماری سرکار کو اگر ذرا سا بھی شک ہو جائے کہ افسر اور کورس میں ہم آہنگی نہیں ہے تو وہ جبراً یا ضرورتاً اس کورس پر اسی افسر کو بھیج دیتی ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ اس دنیا کی نعمتیں مجھ پر زبردستی عاید ہوئی ہیں ہم گئے۔ بہت مگن رہے۔ یہ پورا سال میری زندگی کا سب سے یادگار سال ہے۔ اس لندن کے عین دھڑکتے دل "مار بل آرچ" میں ایک فلیٹ لیا جس میں غل وغوغا غائب اور غسل خانے تین۔ مغرب میں اس سے بڑی جنت اور کیا مل سکتی ہے۔ پشت پر سارا ہائیڈ پارک۔ بائیں بازو میں "آکسفورڈ سٹریٹ" جس کی دکانیں دیکھ دیکھ کر نیت بھر گئی۔

(اگر بیویوں کو فضول خرچی سے بچانا ہو تو ایسی جگہ ٹھہرائیں جہاں "دکان بینی" ——— WINDOW GAZING ہی سے تشفی ہو جائے) دائیں طرف وہ بدنام کوچہ جہاں فرنگی طوائفیں راہ چلتوں کو شہ دیتی ہیں۔ شام کو میرے میاں مجھ سے دس قدم آگے چلتے تھے کہ ان مومی مورتیوں کو پتہ نہ چل جائے کہ وہ بقیدِ نکاح ہیں اور پھر مجھے ان کے چٹپٹے جملے سناتے تھے۔

ہماری تینوں بچیاں جاتے ہی ریجینٹ پارک سکول میں داخل ہو گئیں (اس عرصہ میں ہم اس ملک کے تعلیمی نظام کے قائل ہو گئے)۔ ہم ایک بوڑھا نوکر اپنے خرچ پر ساتھ لائے تھے۔ فرید ہمارا پرانا ملازم تھا اور ہرفن مولا۔ ڈرائیور۔ باورچی۔ بیرا۔ آیا (بچیوں کو اُس نے پالا تھا)۔ مالشیا (صاحب جب کرکٹ کا آدھا سینکڑہ بنا کر ریٹائر کر دیئے جاتے تو بدن عذر سے اکڑ جاتا تھا) اس نوکر کو دنیا نظر لگاتی تھی۔ ترغیب دیتی تھی۔ ہمارے مکان کی مالکہ نے اسے ریڈیو بھی دیا۔ لیکن استاد وفا شعار کہ کسی قیمت پر ہم سے جُدا نہ ہُوا۔

میرے قیام کی کامیابی کا راز فرید بخش تھا. اگر یہ نہ ہوتا تو میں پاؤ لطف بھی نہ اٹھا سکتی اس نیک بخت کو کوئی لت نہ تھی سوائے چائے اور سگریٹ کے. ہر جمعہ کی شام ہم اکثر دو دن کے لیے لندن کے اطراف کی سیر پر نکل جاتے. فرید بخش اپنے کمرے کی کھڑکی سے نہیں ہٹتا تھا. ہزار صلواتیں سنائیں کہ باہر جاکر تفریح کرو." ارے نہیں بیگم صاحب! میں نے تو ساری دنیا دیکھ رکھی ہے دونوں جنگیں یورپ کی لڑا ہوں. گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے یہ لندن میرے لیے کیا شے ہے"؟ فرید بخش کو باوجود دو جنگوں کے صرف تین لفظ انگریزی کے آتے تھے. لیکن اسے کوئی نسلی یا لسانی احساس کمتری نہیں تھا. سینہ تان کر وہ ہر دکان میں گھس جاتا. شاباش ہے لندن کے سوداگروں کی جو اس کی بات نہ سمجھتے ہوئے بھی کبھی اسے اُلّو بنا کر بے ایمانی نہیں کرتے تھے. فرید بخش WOOLWORTH کو گلبرگ کہتا تھا. ان دونوں ناموں میں کیا مشابہت تھی آپ ہی کو معلوم ہو گا یا اس بس کنڈکٹر کو جو اسے "گلبرگ" اتار دیتا تھا. جب اس کا صاحب کہیں کار پیچھے موڑتا تھا تو فرید بخش بازو پھیلا کر سارا ٹریفک روک دیتا تھا. یہ اسی کا دم تھا کہ میری مہمانداری نبھائی. لندن میں سب خوبیاں ہیں. لیکن ایک یہ زبردست کمی ہے کہ وہاں ہم وطن بہت نظر آتے ہیں اور نظر آنا بھی برا نہیں وہ آن کر ٹھہر جاتے ہیں. میرے پہنچتے ہی تیسرے دن مہمان کمرہ جو بھرا تو کم ہی خالی ہوا. ہر محکمے، داخلی، دفاعی کا بڑا چھوٹا افسر، سسرال، میکے کا دوری قریبی عزیز. سہیلیاں یار دوست کون ہے جو وہاں نہ آیا.

آخر میں ایک دوست بولے کہ اپنے گھر کے آگے بورڈ لگا دو "کہ ریاض کے پاس ٹھہرو اور لندن دیکھو"

اس کے علاوہ ڈیفنس کالج کے ۶۵ جوڑے تھے جو ایک دوسرے سے ملنے کے لیے کوشاں رہتے. ہفتے میں چار دن باہر کھاتے تو ساتویں دن خود ڈنر دینا پڑتا. کالج کے انگریز جوڑے عموماً لندن سے باہر اپنے "ڈمی" گھروں اور باغوں میں بلاتے تھے. لندن کی

دخانی سڑکیں چھوڑ کر دس میل پار کرتے ہی اس کی دیہی گردونواح COUNTRY SIDE شروع ہو جاتے ہیں جس کے لیے وہ مشہور ہے اور انگریزوں کو باغبانی سے عشق ہے. تھکے ہارے دفتروں سے آکر بھی وہ باڑیں کاٹنا بیج بونا شروع کر دیتے ہیں. باغبانی ایک صلح کُل مشغلہ ہے ازدواجی تنازعہ سے بچائے رکھتا ہے. بیوی کی ناک یا چٹیا کاٹنے سے بہتر ہے کہ باڑ کاٹتے رہو اس سارے قیام کا ہیرو ڈیفنس کالج ہی تھا. اگر دنیا میں کوئی بہترین کورس ہے تو "آئی ڈی سی" افسوس کہ یہ دوبارہ نہیں ملتا. یورپ کے بہترین دماغوں، انگلستان کے مشہور لیڈروں. پروفیسروں صحافیوں کو باری باری تقاریر اور مباحثے کے لیے مدعو کرتے ہیں ہر بدھ کو چائے پارٹی پر بیویاں بھی بلائی جاتی ہیں اور پھر چُنے چُنے فلم دکھائے جاتے ہیں. مہینہ میں ایک "کاک ٹیل" ڈنر اور ڈانس بھی ہو جاتا ہے. غرضیکہ امریکہ اور دولت مشترکہ کے دلچسپ لوگوں سے مل کر ذہنی فراخی ملتی ہے

اس کالج میں کوئی امتحان نہیں کوئی پابندی نہیں. صرف ذہنی ضیافت ملتی ہے. کبھی کبھی میرے میاں ہفتے اتوار کو ملا کر پیرس یا پرتگال کھسک جاتے تھے اور بہانے بھی ان کو قدرت کی طرف سے ملے ہوئے تھے. کبھی "آئی سی اے" کی کبھی ایکشن اولمپک کمیٹی کی میٹنگ.

تین مہینے کے اندر میرے میاں کو اپنا ملک یاد آنے لگا. فرمایا "یہ کالج تو محض علمی عیاشی ہے. اپنے ملک کے اتنے لاینحل مسئلے پڑے ہیں کہ وہیں جاکر کام کرنا چاہیے. یہ سارا سال میرے لیے نیک شگون تھا. لیکن ریاض صاحب کے لیے ایک سرکاری لطیفہ. قصہ یہ کہ ان کو لندن بھیجا گیا کہ ڈیفنس کالج میں جاکر سیکھو اور واپس آکر کراچی میں اسی طرز کا کالج ترتیب دو. چھ مہینے بعد حکم صادر ہوا کہ ڈیفنس کالج التوا میں پڑ گیا ہے اب گرمی کی چھٹیوں میں تم امریکہ جا کر پبلک نظام سیکھو تاکہ واپسی پر لاہور میں "سٹاف کالج" چلا سکو. جب یہ امریکہ سے ہر یونیورسٹی کا پانی پی پی کر واپس آئے تو تیسرا اعلان کاغذی شائع ہوا کہ تم کو کمشنر امداد باہمی متعین کیا جاتا ہے ان دفتری داستانوں کو درج کرنے کے لیے ایک بیربل کی ضرورت ہے کیونکہ دہی بزلہ سنج بتا

سکے گا کہ سرکاری احکام میں منطق اور مزاح کی کیا آمیزش ہے۔

ہمارے فلیٹ کی مالکن "رما" ایک قابل ہنر مند بنگالن تھی جس نے "بالسٹری" پاس کر لی تھی اس کا پنجابی میاں ایک سیلانی تاجر تھا جو دنیا بھر میں گھومتا تھا اور شاذ نادر گھر آتا تھا۔ رما دل کی اچھی اور دماغ کی اس سے بھی اچھی۔ جب بنگالی ڈش پکاتی تو ہم کو ضرور کھلاتی۔ اُن کے یہاں افریقہ اور ایشیا کے طلبا اکثر جمع رہتے جن سے مل کر خوشی ہوتی اور معلومات بڑھتیں۔ رات کو ڈنر کے بعد جب کبھی مغربی رقص کی محفل جمتی تو ہم کو گھسیٹ کر لے جاتی۔ اس کی چھوٹی تین سالہ بیٹی "گوری" بہت مزے کی زبان انگریزی میں ملا کر بولتی تھی۔ میں ایک دن قلم پکڑے اپنے صوفے پر بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ جناب گھسیں اور بولیں "کیا تمہیں لکھنا نہیں آتا، میں لکھ دوں"۔ ایک دن منہ مُنھجائے آن دھمکیں "میری ماں اپنے آپ کو دنیا کا بہترین "کوکر" سمجھتی ہے، مار مار کر اپنے ہاتھ کا بدمزہ کھانا مجھے کھلاتی ہے"۔ رمانے ایک لٹے ہوئے مہاراجہ موروی سے "برک ہرسٹ پیلس (BURKHURST PALACE) سستے داموں لے لیا۔ کچھ سال بعد اس کی قیمت دس گنا ہو گئی۔ ہمارے سامنے شہزادی مارگریٹ نے اسے ۶۵ ہزار پاؤنڈ کی پیش کش بھیجی۔ لیکن رمانے رد کر دی۔ یہ محل "ونڈسر کاسل" کے بالکل قریب آٹھ ایکڑوں میں بسا ہوا ہے۔ دو نہانے کے تالاب۔ چار ٹینس کورٹ، شجرستان۔ خود محل کے اکیس کمرے سجے سجائے۔ ایرانی قالین، بلوریں جھاڑ فانوس، نقرئی گلدان۔ لیکن ساری فضا پر ایک حسرت برس رہی تھی۔ ایک ہوک سی اُٹھی! کیا پرانے وقت ہوں گے جب راجہ مہاراجہ لندن میں آکر اس سج دھج سے رہتے تھے! زمانے نے کیا پلٹا کھایا ہے! جو بھی سہی عہد رفتہ میں ایک رنگینی تھی۔ ایک وضعداری تھی۔ اس کے فراخ سایوں میں ہزاروں فنکاروں، ناٹکوں اور دستکاروں نے برطانوی بے اعتنائی سے بچ کر پناہ لی۔ روزی اور تشفی پائی۔ افسوس راجہ نواب تو مٹ گئے! لیکن ان کی جگہ نئے ساہوکاروں نے صرف دولت کمائی۔ مگر اس کا صحیح مصرف نہ جانا۔ ہمارے مصوّر، مصنف آج بھی در بدر پریشان حال پھر رہے ہیں۔

لندن میں پھولوں کی ایک مخصوص نمائش، CHELSEA FLOWER SHOW ہوتی

ہے۔ اس کے ٹکٹ سال بھر پہلے بک جاتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست ایڈمرل گریٹن کی نیم فرانسیسی بیوی، میرے مختلف مشاغل سے واقف تھی۔ اس نے اپنے میاں کے ٹکٹ پر مجھے مدعو کیا۔ دن مقرر! وقت مقرر! ملنے کی جگہ فلاں ٹیوب سٹیشن کے دروازے پر دس بجے قرار پائی۔ ہم دونوں عین وقت پر ٹیوب اسٹیشن کے دروازے پر بے چینی سے دو گھنٹے تک ایک دوسرے کا انتظار کرتے رہے۔ وجہ یہ تھی کہ ٹیوب سٹیشن کے تین دروازے ہیں اور پروگرام طے کرتے وقت دونوں یہ مقرر کرنا بھول گئے کہ کونسا دروازہ۔ خیر دو گھنٹے کی کوفت، دھل گئی۔ جب ہم نمائش میں داخل ہوئے۔ بلا شبہ یہ بین الاقوامی پھولوں میں اولین تھی۔ ہر ملک نے اپنے سٹال سجائے تھے۔ افریقہ، یورپ ایشیا کا کوئی پھول ہوگا جو نہ پہنچا ہو" سویٹ پنیز" کی ۳۲ قسمیں، گلاب کی ۱۱۵۔ کاسنی گلاب اور سیاہ فام گلاب میں نے پہلی دفعہ وہاں دیکھے۔ چٹائیوں پر انہوں نے کئی قسم کی "ٹرف" اگا رکھی تھی۔ میرے مولانے اس مشتِ خاک میں کیا کیا تاثیریں پنہاں کی ہیں ...... !ان بے کیف مٹی کے ذرّوں سے کیا کیا مخملیں، ریشمیں رنگ پھوٹتے ہیں۔ کیا کیا حسین خط و خال ابھرتے ہیں۔

ڈیفنس کالج میں یہ لطیفہ زد زبان ہوا کہ مسز ریاض اپنے میاں کی گاڑھے پسینے کی کمائی وہ بھی زرمبادلہ میں، تھیٹر میں ضائع کر رہی ہے۔ یہ سچ تھا کہ میں نے صرف "ریویو" چھوڑے اور کچھ نہیں چھوڑا۔ ہر ہفتے "سلفرج" کی بالائی منزل پر جا کر دو چار ٹکٹ بک کروا آتی تھی عموماً دوپہر کو میٹنی کے جب میاں صاحب اور بچے گھر پر نہ ہوں۔

آٹھ دس شلنگ میں خاصی اچھی نشست مل جاتی تھی اور لندن کا معمولی ڈرامہ بھی اور ملکوں سے بدرجہا بہتر ہے۔ یہ عجب بات ہے کہ انگلستان میں فلموں پر زبردست اخلاقی پابندیاں عاید کی گئی ہیں لیکن تھیٹر کو سینسر CENSOR اور "لارڈ چیمبرلین" نے کھلی آزادی دے رکھی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کوئی عریانی ایسی نہیں جو سلیقے سے سٹیج پہ پیش نہ ہو سکے۔ "گراہم گرین" کے پرشرارت مکالمے "ارمالاڈوس" کے طوائفی جملے سن کر میرے کان سرخ ہو جاتے تھے لندن سٹیج کے پانچوں گرو جو کنگ آرتھر کی گول میز کے "نائٹ" کہلاتے ہیں۔ باری باری

مختلف ڈراموں میں دیکھے "سر ایلک گی نیس" کو لارنس آف عربیا کے لباس میں دیکھا اور پول سکو فلیڈ لے سر مائیکل ریڈ لوگریو، سر رلیف رچرڈ سن کے خداداد جوہر کی نت نئی گہرائیاں دیکھیں۔

ایک سادی شام "سر جون گیل گوڈ" کے ساتھ گزاری۔ شیکسپیر کے مختلف المیہ، مزاحیہ تاریخی ڈراموں اور نظموں کو اس شخصیت نے تین گھنٹے سٹیج پر تن تنہا پیش کیا۔ ہر دفعہ مختلف انداز میں مختلف کرداروں کو جس طرح شیکسپیر نے صفحہ پر تشکیل دیا۔ یہ محض آواز اور ادائیگی سے پیش کرتا تھا۔ ہم بھول جاتے کہ او تھیلو یا ہنری چہارم کا زمانہ نہیں بلکہ بیسویں صدی کا لندن ہے جہاں گیل گوڈ کوٹ پتلون میں یہ مکالمے ادا کر رہا ہے۔ تین گھنٹے متواتر بغیر لباس بدلے۔ بغیر کتابی مدد یہ اس تھیٹر کے جن نے ہمیں مسحور کر دیا تھا۔ جب آخر میں اس نے "کنگ لیئر" KING LEAR کے وہ نالے سنائے جو وہ اپنی بیٹی کارڈیلیا کو موت کے بازوؤں میں بناتا ہے تو دل تو کیا سارا ہال ہل گیا۔ جس وقت وہ معمّر فنکار HOWL، کہتا تھا۔ ساری فضا جھنجھنا جاتی تھی۔ واللہ علم کہاں سے آواز نکالتا تھا۔ سنا ہے یہ اس پیر کامل کا موروثی راز ہے جو سینہ بہ سینہ چلا آ رہا ہے۔ جسم کے ڈھانچے سے ایسی آوازیں نکالتا کہ کوسوں دور قبر کے مردے جگا دے۔

لندن سٹیج کی نامی گرامی لقب یافتہ ایکٹریس بھی دیکھی اور قائل ہو گئے ڈیم فلورا روبسن ڈیم سبل تھورن ڈائیک ڈیم جوڈتھ اینڈرسن یہ خواتین کتنی ہی عمر رسیدہ، ان کا فن ہمیشہ جوان رہے گا۔ ایک شام ہمارے پاس دعوت نامہ آیا۔ لارڈ چانسلر کا ملکہ معظمہ نے ساڑھے چار بجے پارٹی پر یاد فرمایا ہے۔ حاشیے میں لکھا تھا "بشرطیکہ بارش نہ ہوئی۔ یہ لندن کا موسم اپنی ملکہ کا بھی لحاظ نہیں کرتا۔ خیر صاحب ہم تیار ہو کر اس دن پہنچے۔ ایک خلقت امڈی ہوئی تھی بکنگھم پیلس کے کشادہ لان میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی ویسے یہ باغ انگریزی لحاظ سے بہت کمزور قسم کا ہے۔ ہمارے گورنمنٹ ہاؤس اس سے بہتر ہیں۔ اللہ ہو غنی!! انگلستان کے جدی روسا ٹیل کوٹ اور تمغوں کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ بعض کے سینوں پر اتنی تعداد میں تمغے لٹک رہے تھے جو کہ اکثر شعبدہ بازوں کی وردی پر ہوتے ہیں۔ بعض لارڈز اور

نائٹ اتنے عمر رسیدہ تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری انیسویں صدی انہوں نے گود میں کھلائی ہے۔ بعض تو مکفون مردے نظر آتے تھے جو قبر پھاڑ کر اپنی سامراجی عظمت کو دوبارہ چکھنے نکل آئے ہیں کئی کی پلکیں، بھنویں سفید ہو کر جھڑ چکی تھیں۔ بعض نے کالی پنسل کے آبرو کھینچے ہوئے تھے۔ مجھے ایک دم کراہت آئی۔ بہت زیادہ نکھری ہوئی سفیدی دیکھ کر یوں احساس ہوا کہ DECADENT ARISTOCRACY کیا چیز ہو سکتی ہے۔ ان کی جڑیں تہ زدہ تھیں۔

کچھ دیر بعد ہلکی پھوار شروع ہو گئی۔ اگر یہ اصیل نہ پڑتی تو لندن والے اس پارٹی کو مستند کیسے مانتے۔ اگر انگلستانی شے ہے تو ضرور رسیلی ہو گی۔ پلک جھپکتے میں ہزاروں چھتریاں کھل گئیں۔ یا اللہ یہ کہاں سے آ گئیں۔ کیا محل میں کرائے پر چلتی ہیں۔ پتہ چلا کہ ہر مرد کے ہاتھ میں جو نازک سی چھڑی تھی وہ اصل میں چھتری تھی۔ میں سمجھی کہ یہ چھڑی ٹیل کوٹ کے ساتھ لازمی دم چھلا ہے۔

اتنے میں بینڈ بجا اور ملکہ کی آمد کے لیے چوبداروں نے راستے بنانے شروع کیے۔ مہمان پلے پڑ رہے تھے۔ زیارت کے لیے، محل کے ڈپٹی نے ان کو ہٹا ہٹا کر قطاریں لگوائیں۔ تاکہ ملکہ ہر ایک کو ذرا ذرا مسکراہٹ بانٹ سکے۔ ہاتھ ملانا تو ناممکن بات تھی تو خیر صاحب، انتظار ختم ہوا۔ برطانیہ کی جوان ملکہ جو ابھی زچگی سے اٹھی تھیں داخل ہوئیں۔ چہرے پر چھائیاں رنگت پیلی۔ ہنسی گھگھیائی کہا یہ مکھڑا تھا جسے بی بی سی کے ناشر نے گلاب سے تشبیہہ دی تھی۔ (ROSE IN CELLOPHANE) پوچھا ہو تو ایسی۔ انگریز اس شاہی چہرے کی زیارت کے لیے دو دن پہلے قطاریں لگانی شروع کر دیتا ہے مجھے اس پر جارج مکیش، بے ساختہ یاد آ گیا۔ اس نے انگریزوں کا خاکہ اپنی کتاب میں اڑایا ہے۔ لکھا ہے: "انگریزوں کو باہر کھلی فضا میں سیر و تفریح کا بہت جنون ہے بشرطیکہ وہ قطاریں لگا سکیں" پچھلی جنگ عظیم میں ہر چیز کے لیے قطار لگاتے لگاتے اب یہ مجبوری ایک قومی شغل بن گئی ہے۔ ایک اور جملہ اس مزاح نگار کا یاد آیا: "فرانسیسی کے پاس جنسی لذت اور انگریز کے پاس گرم پانی کی بوتل"۔

ہمارے قیام میں ہر قسم کے مہمان آئے۔ لیکن ایک مہمان بلائے جان تھے اور وہ تھے راجہ غضنفر علی دیسے میں اور میرے میاں ان کو ایک بزرگ کی طرح مانتے تھے (جس لفظ "بزرگ" پر دہ چڑ

بھی جاتے تھے لیکن ان کے دل کا کسی وقت اعتبار نہیں تھا۔ تھرموسس کے دیرینہ مریض تھے۔ سیڑھیاں وہ چڑھ نہیں سکتے تھے۔ اپنی بنگالن مالکن کی منت کر کے نیچے کمرہ خالی کرایا لیکن راجہ صاحب اس قدر زندہ دل تھے کہ اوپر پہنچ جاتے تھے۔ ہزار سمجھایا۔ ڈاکٹروں نے دھمکایا۔ کوئی اثر نہیں۔ لیکن یہ زندگی کے شیدائی ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ آتے ہی پوچھنے لگے۔ میں کیا دیکھوں۔ میں بولی۔ آپ نے تو چپہ چپہ دیکھ رکھا ہوگا۔ بولے مطلق نہیں ۱۹۲۸ء میں مہاراجہ بیکانیر کے ساتھ آیا تھا اور اس کی اردل میں رہا تھا۔ مجرے دیکھے گھڑ دوڑ دیکھی مگر لندن نہیں دیکھا کہاں ۱۹۲۸ء اور کہاں ۱۹۶۰ء!! لندن نے اس عرصہ میں کتنی کروٹیں لیں کتنی شکلیں بدلیں۔ بہر حال میں نے راجہ صاحب کو برابر تین دن صبح سے شام لندن کے "کوکس ٹور" کے مزے دلوا دیئے۔ دیکھ دیکھ کر ہانپ گئے لیکن شوق پھر بھی پورا نہ ہوا۔ شام کو مجھے اور ریاض صاحب کو نائٹ لائف دکھانے لے جاتے۔ میں کوئی مومنہ نہیں۔ لیکن شبانہ زندگی کی نسوانی عریانیاں دیکھ کر مجھے قلق ہوتا ہے۔ کسی صدی میں بھی عورت کو اتنا ذلیل نہیں کیا گیا جتنا کہ اب۔ پہلے عورت حرم میں ناچی، غلاموں کی منڈی میں ناچی۔ لیکن اب ہر صفحے ہر پردہ سیمیں پر، ہر سٹیج اور ہر اشتہار میں عریاں ہے۔ یہ عورت کا سراسر تجارتی و فحش استعمال ہے بہر حال سب چھوٹے بڑے ہوٹلوں میں گئے۔ لیکن پیرس کی نائٹ لائف کے بعد لندن کچھ مدھم اور بدمذاق معلوم ہوا۔ فرانسیسی اس نفاست سے نسوانی بدن پیش کرتے ہیں کہ احساس بھی نہیں ہوتا۔ خیر ایک شو بُرا نہیں تھا۔ "ڈینی لارد" جس کی ہیروئن بہت خوبصورت ہے اور حاضرین اس وقت اپنی حماقت کو سمجھتے ہیں۔ جب وہ ہیروئن اپنے بال اور لباس اتار کر اور لباس کے نیچے سے دو گول ربڑ ہٹا کر اپنے کو اچھا خاصا مرد ثابت کرتی ہے۔

ہم ایک شام چارلی چپلن کی فلموں کا سلسلہ دیکھ کر واپس آ رہے تھے۔ دس بجے تھے لیکن راجہ صاحب کے لیے رات ابھی شروع ہو رہی تھی۔ بس کی لیڈی کنڈکٹر سے معصومانہ انداز میں پوچھتے ہیں۔ ہم اب کہاں جائیں؟ وہ ہنس کر بولی "سارا لندن تمہارے قدموں میں ہے

جہاں کہو تمہیں لے چلیں"۔ راجہ صاحب کی بدولت سارے جوئے خانے بھی جھانکے۔ ایک "سلور سٹی" (جوا خانہ) پسند آیا جہاں شکاری کتوں کی ریس ہوتی ہے۔ آپ کو جو بھی تھوتھنی پسند ہو پیسے لگا دیجئے۔ ہم نے بالائی نشستوں پر میز الگ کروالی اور وہیں ڈنر بھی منگوا لیا۔ کھاتے جا رہے ہیں اور ویٹر ہماری طرف سے ٹکٹ خریدتا جا رہا ہے۔ اس ٹھاٹھ سے ہم نے کم جوا کھیلا ہوگا۔ کتے گھوڑوں سے بھی زیادہ چنچل اور سبک رفتار تھے۔ کبھی راجہ صاحب کا کتا ہارتا تھا کبھی ہمارا۔ غرضیکہ اچھا خاصا لطف رہا۔ چند شلنگ ادھر یا ادھر۔ ریس کورس چاروں طرف بھرا ہوا تھا۔ انگریز قوم بھی جوئے کی بڑی دھنیا ہے۔ کچھ نہیں تو کتوں پر ہی شرط لگاتی رہتی ہے۔ اب ڈربی کی ریس آرہی تھی۔ راجہ صاحب نے ہم سب کو تیار کر کے ٹکٹ بھی لے لیے تھے۔ اس ریس میں چرچل کا بھی گھوڑا تھا۔ ریاض صاحب کا خیال تھا کہ چرچل بڑا خوش قسمت انسان ہے اس کا گھوڑا ضرور جیتے گا۔ آپ نے چھ شلنگ لگا دیئے غریب ریس کے پہلے فرلانگ میں ہی لنگڑا ہوگیا اور اس کو گولی ماردی گئی۔ جوئے میں قسمت نے بھی کوئی خاص میرا ساتھ نہ دیا۔ انگریزی کا محاورہ ہے کہ محبت کے دھنی کو پیسہ نہیں ملتا۔ بہرحال ڈاربی کیا تھی، ایک میلہ تھا۔ کیا اژدہام! کیا شور! میں دعائیں مانگوں کہ یا اللہ راجہ صاحب نہ جیتیں۔ کیونکہ ہر دفعہ مجھے پیسے لینے کے لیے لمبی قطار میں کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ راجہ صاحب اپنے دل کی وجہ سے بیٹھے ہوئے تھے اور ریاض صاحب اپنی ہار کے غم میں۔ ہر ادارہ ہر دفتر اپنی اپنی بسیں اور ٹرکس پر اپنے اپنے جھنڈے لگا کر آیا ہوا تھا۔ شاہی باکس الگ تھا۔ جس میں برطانیہ کا سارا نیلا خون منجمد تھا۔ ملکہ الزبتھ سب سے زیادہ محظوظ ہو رہی تھیں ہر دوڑ میں کٹہرے سے آدھی باہر نکل کر تالیاں بجاتی تھیں۔

راجہ صاحب ہم کو دنیا کے سب سے فیشن زدہ ریس کورس "دی ایسکٹ" ASCOT پر بھی لے گئے۔ یہاں ہجوم کم ناز و ادا زیادہ۔ ایک سے ایک حسین نازنین یورپ نے انمول لباس میں تیتری سی ہلکی چھڑی لگائے سامنے سے مٹکتی گزر جاتی تھیں۔ راجہ صاحب پہلی دفعہ گھوڑوں

کو بھول کر ان غزالانِ رعنا کی دید میں مست ہو گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس سارے کھیل میں راجہ صاحب ۱۵۰ پونڈ ہار گئے تھے۔ سخت غصہ آیا۔ ان کی ان عادات کو اس عمر میں کون بدل سکتا ہے۔ ہمارے گھر سے بیٹھے بیٹھے ہالینڈ بیگم لیاقت کو ٹیلی فون کیا کرتے تھے کہ وہاں جو گھڑ دوڑ ہو رہی ہے۔ اس پر فلاں فلاں اصیل پر اتنے پیسے لگا دو۔ میں گرجی کہ اپنی نیلامی بول کر جائیے گا۔ وہ زمانے گئے جب آپ کی طرّہ دار پگڑی پر بولی لگا کرتی تھی"۔ مگر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ڈھٹائی اور بخت شاید ہم معنی ہیں۔ ایک ہفتے کے اندر اندر انہوں نے ہالینڈ میں رہ کر ۱۵۰ واپس کما لیے۔ بیگم لیاقت بھی ان کی ہم پلّہ نکلیں۔ راجہ صاحب نے بتایا کہ ان کے پاس بھی ہر گھوڑے کا شجرہ کھلا تھا اور ہزاروں فائلیں ان کی ریسرچ پر وقف تھیں۔

مہارانی جے پور کے ہم پرانے عاشق ہیں۔ اتنی ملیح اور حسین عورت کم دیکھی ہے۔ وہ اس زمانے میں لندن میں تھیں۔ راجہ صاحب سے پرانے تعلقات تھے۔ انہوں نے "ونڈسر کاسل میں ہم کو پولو پر بلایا۔ ڈیوک آف "ایڈنبرا" ایک طرف کپتان اور دوسری طرف مہاراجہ جے پور بہت دلچسپ میچ رہا اور سارا خاندان معہ چار پشتوں سے قریب سے دیکھا۔ میں ابھی تک نہ سمجھ سکی کہ اس دور میں شہنشاہیت کا جواز کیا ہے۔ یہ تو اس طرح بے تکی معلوم ہوتی ہے، گویا اٹھارھویں صدی کی کترن کاٹ کر بیسویں صدی کی آزاد عبا میں پیوند کر دی گئی ہو۔

اصل میں لندن میں انسان دیوانہ ہو جاتا ہے کیا کیا کرے اور کیا کیا نہ کرے اخبار اٹھائے تو بہترین نمائشوں۔ سینما۔ تھیٹر۔ جشن موسیقی۔ ناچ گھر۔ لیکچر، مباحثے کے اشتہار، ہزاروں کورس مفت، کاؤنٹی کونسل کے کسی ادارے میں چلے جائیے۔ برٹش کونسل کی ممبر بن جائیے، وہیں دو چار معیاری محفلیں مہینے میں منعقد ہوتی ہیں۔ برٹش میوزیم کی لائبریری کے لیے ایک عمرِ دراز چاہیے۔ لیکن چھوٹی چھوٹی لائبریریوں میں بھی، ہمارے معاشرہ پر زیادہ کتابیں ملتی تھیں بہ نسبت ہماری یونیورسٹیوں اور کالج کی لائبریریوں کے۔ اگر میں کسی کتاب کی فرمائش کرتی تو

وہاں فوراً منگوا کر دیتے تھے۔ لندن میں نہایت چھوٹے چھوٹے سینماؤں کا سلسلہ ہے جسے کلاسیکس CLASSICS کہتے ہیں۔ یہ ہر علاقے میں ہوتا ہے۔ ٹکٹ تین سے چھ شلنگ تک کا۔ اس میں صرف بین الاقوامی انعامی فلم دکھائے۔ کئی ذرا معیوب، لیکن فنی پیمانوں پر پورے اترتے ہیں۔ انہی میں ایک وقت میں چھ ایسی فلمیں چلتی ہیں۔ جنہیں نہ دیکھنا عین محرومی ہے

ایک ہفتے میں لندن میں مندرجہ ذیل پروگرام چل رہے تھے۔

(۱) بین الاقوامی کھانے کی نمائش ۶۵ سٹالوں پر ہر ملک کے اپنے اپنے مخصوص و معروف طعام۔ اس کے نسخے مفت ملتے تھے۔ چکھتے چکھتے پیٹ بھر جاتا تھا۔

(۲) روسی سرکس کا ذکر بے کار ہے۔ گھنٹوں لگ جائیں گے۔ خود دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ آسمان پر تھگلی لگانے والی قوم اکھاڑے میں کیا کیا کر سکتی ہے۔

(۳) بہتر گھروں کی نمائش "دنیا بھر کے "خانہ آرا" INTERIOR DECORATORS نے اپنے اپنے ملک کے تازہ ترین طرز زیبائش کا مظاہرہ کیا۔

(۴) رام گوپال۔ اندرانی، رحمان۔ روی شنکر کے مختلف کونسرٹ۔

(۵) ہسپانوی رقاص "اینٹونیو" کا شو۔

(۶) فرانس کا بیلے۔

(۷) دی آنا کا آرکسٹرا۔

(۸) بین الاقوامی کاروں کی نمائش۔

(۹) تنگر اچاریہ مشن کے لیکچر۔

(۱۰) "پکاسو" کی سب سے بڑی نمائش جو ٹیٹ گیلری کے دس بڑے ہالوں پر غالب تھی۔ چل چل کر جب میرے جوتے چھوٹے ہو گئے تو میں نے دونوں اتار کر ایک کونے میں رکھ دیئے۔ وہاں کا حاضر جواب چوکیدار بولا۔ "انہیں الٹے سیدھے ٹانگ دو تو یہ بھی "پکاسو" ہو جائیں گے۔"

قصہ کوتاہ، لندن کی ثقافتی سرگرمیاں سال تا سال ماہ بہ ماہ اسی رفتار، اسی معیار سے

چلتی رہتی ہیں۔

لندن جاکر ایک بات سمجھ میں نہ آئی کہ وہ برطانوی قوم جو ہندوستان میں دو صدی رہ کر بھی مرچ مسالوں سے پرہیز کرتی تھی، ہند کو آزادی دیتے ہی اس قدر دیسی کھانے کی متوالی کیسے ہوگئی؟ لندن میں اپنا کھانے پکانے کو جی نہیں چاہتا تھا کہ چپّے چپّے سے قورمے پلاؤ کی مہک آتی تھی۔ ہماری غذائی کلچر نے وہاں چین کو بھی مات دے دی۔ ساٹھ سے اوپر سودیشی ریستوران ہر وقت کھچا کھچ زیادہ تر سفید فام باشندوں سے، بھرے ہوتے ہیں جن میں عموماً بنگالی خانساماں اپنے کمالات دکھاتے ہیں۔ لندن میں کیا نہیں ملتا؟ دلّی کی لذیذ ترین چاٹ کا مسالہ ڈبوں میں۔ سوکھی سرخ مرچ کا آچار۔ الفانسو آم۔ بنگال کے جلاجو گارس گلے، سبھی نعمتیں ہیں۔ اس کے بعد روحانی غذا کا بھی ذکر ہو جائے۔ یہاں تین مسجدیں ہیں۔ ایک "ایسٹ اینڈ" میں جو غریبوں کا علاقہ ہے (خدا اور کہاں بسے گا؟) دوسری "ووکنگ" میں، تیسری مسجد "بیکر سٹریٹ" میں غریبوں کی مسجد میں جنرل حق نواز اور میرے میاں کبھی کبھی وعظ کرتے جاتے تھے اور اسلامی تبلیغی مشن کو اخلاقی مدد بہم پہنچاتے تھے۔

عید پر مسجدوں میں سڑک تک نمازی ابل رہے تھے۔ کچھ پاکستانی اپنی انگریز بیویوں کو تماشہ دکھانے لائے تھے۔ کچھ سیاہ حبشنیں نیم عریاں فراکوں میں سجدے یا رکوع میں تھیں۔ کئی فرنگی بھی تھے جو نئے نئے مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ کچھ دیر میں قورمہ پلاؤ نمازیوں کے سر اور کندھوں پر گھما گما کر بٹنا شروع ہوا مسلمان کھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ خانۂ خدا میں بھی مصروفِ غذا ہے۔

لندن کے نامی باغ "کیو گارڈن" (KEW GARDEN) میں جاؤ تو وہاں اشجار کی ایک الگ دنیا آباد ہے وہاں کلد کھوالا لولا: "ابھی تو ہم نے صرف چھ لاکھ اقسام کا تجزیہ کیا ہے" خدا کی دنیا میں تو ابھی لاکھوں بوٹے اور بھی ہیں۔ اس باغ میں جب موقع ملا، میں نے خاموشی سے دو تین دوپہریں گزاریں۔ حسن اور سکون یکجا ہوں تو اور کیا چاہیے۔ "ہیمپس ٹیڈ ہیتھ"

HAMPSTEAD HEATH ، جس کے خنک سایوں میں کیٹس نے عشق اور فنا پہ نغمے اور سانیٹ لکھے۔ لندن کے ان کئی حصوں میں سے ہے جہاں وہم و گمان بھی نہیں ہوتا کہ اتنے دخانی کارخانے بھی اس شہر میں ہو سکتے ہیں۔ ہائیڈ پارک میں اگر اتوار کو ٹہلنے نکلتے تو جگہ جگہ بھانت بھانت کے مقرر، بقول شخصے پٹی الٹ کر تقریر کر رہے ہوتے تھے۔ اس میں ایک کھیم کی کہتے اور دوسرا پورب کی۔ کوئی دہریہ، کوئی میتھڈسٹ، کوئی کیوبن، کوئی جمیکین۔ ہر ایک زبان مشتق گویائی میں مصروف ہے ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔ ایک طرف سے آواز آتی ہے "حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود کنوارے تھے اور کہتے تھے کہ صرف وہ کنوارے جنت میں جائیں گے اس لیے صاحبان آپ بھی شادی نہ کریں۔" دوسری للکار آئی "کل سینٹ پال گرجا سے مذہب کا جنازہ نکلے گا۔ آپ خود شرکت نہ کرسکیں تو کم سے کم ٹیلی ویژن پر اس کی آخری شکل ضرور دیکھ لیں۔" تیسری صدا آئی "ہمارا شاہی خاندان ذہنی بیماریوں سے پڑ ہے۔ ہماری ملکہ خود سنکی ہے۔ اس کا باپ شاہی دزد تھا لیکن ماں میں کسی بنیے کا خون ہے، اس کا میاں اپنی سالی پر عاشق ہے۔ یہ خبطی ملکہ ......" میں نے سوچا۔ پاس کھڑا سپاہی اب صبر نہیں کرے گا۔ مقرر کو ضرور پکڑے گا۔ لیکن توبہ کرو۔ بلکہ جب ایک شہنشاہیت کے شیدائی نے مقرر پر حملہ کیا تو سپاہی نے حملہ آور کو پکڑ لیا۔ یہ ہے آزادی کا اصل روپ اور اصل جمہوریت!

LAKE DISTRICT ، کالج میں اکثر انگریزی ادب پڑھاتے ہوئے سوچتی تھی کہ یا اللہ یہ "جھیلوں کا ضلع" کیا شے ہو گی۔ جس نے ہر شاعر کے کلام کو نئی ترنگ دی، ہر ادیب کو نئی تشبیہات دیں۔ جس کا حسن خالق کائنات کی محبوب صناعی کہا جاتا ہے اللہ میاں نے میرے سب ارمان پورے کر دیئے ہیں "وٹ سن" کی چھٹیوں کے ساتھ ہفتہ اتوار ملا کر ہم اپنی نئی کار شیور لیٹ میں روانہ ہوئے۔ پہلی دفعہ برطانیہ کی نئی تیز رفتار شاہراہ "M1" پر اسی میل کی رفتار پہ کار چلائی، جس کا اتنا ہی احساس ہوا جو ہماری سڑکوں پر پچیس میل کی رفتار کا لطف آ گیا ڈرائیوری کا۔ ہمیں چلنے سے پہلے دوستوں نے دو نصیحتیں کی تھیں کہ "لیک ڈسٹرکٹ"

ایک تو کار سے نہ جانا. دوسرے گرمیوں میں کبھی نہ جانا. ہم نے دونوں نہیں مانیں. ان تکلفات میں پڑے تو انسان کچھ نہ دیکھ پائے. ان مندرجہ بالا نصیحتوں کے اسباب معقول تھے. کہتے ہیں کہ اس خداداد علاقے میں موٹر کار سے داخل ہونا اس کے حسن کی بے حرمتی ہے. ٹرین سے جاؤ، دور سے ریلوے سٹیشن پر اتر جاؤ اور پھر پیادہ کندھے پر زنبیل ڈال کر جگہ جگہ اس کیمپن کا پاکا نیز تھ کرو جہاں مرضی ہو رکو، جہاں مرضی ہو سوؤ. یہ واقعہ ہے کہ یہی بہترین طریقہ ہے اس خطّے کو دیکھنے کا. کیونکہ کار سڑک سے جو کچھ دکھا سکتی ہے وہ محدود نظارہ ہے. اس کے بے پناہ اندرون میں انسان اطمینان سے گم ہو سکتا ہے. لیکن پیدل چلنے کے لیے نہ ہمارے پاس وقت تھا نہ تجربہ. گائیڈ کی تفصیلی ہدایات پڑھ کر اور ڈر گئے۔

۱. اپنے ساتھ موٹے خاردار جوتے لائیں۔

۲. ایک دبیز برساتی جو وقت پڑے خیمہ بھی بن جائے۔

۳. چوبیس گھنٹے کا کھانا یا کم سے کم پودینے کا کیک، آپ کی کمر کی پیٹی سے بندھا ہو

۴. شوخ رنگ کے رتر جیجاً لال، کپڑے پہنیں تاکہ لائف گارڈ دور سے دیکھ کر آپ کو بچالے جب کبھی سورج غیر حاضر ہو تو کہر ایکدم اندھیرے کی طرح چھا جاتا ہے

۵. ایک عدد جہاں نما اور سیٹی بھی لازم ہے. ہم نے سوچا خدا نوبت نہ لائے کہ سیٹی کی ضرورت پڑے. ہماری موٹر کا ہارن ہی اچھا۔

ہمارے سوات کی طرح اس خطّے کو دیکھنے کے لیے کہتے ہیں کہ اکتوبر یا اپریل کا موسم بہترین ہوتا ہے اس لیے یہاں گرمیوں میں نہیں آنا چاہیے کیوں کہ یکساں موسم منظر میں بھی یکسانیت پیدا کر دیتا ہے. صاحب یہاں ہمیں تو اس یکسانیت میں بھی تنوع نظر آیا. ایک ایک وادی میں پانچ پانچ رنگ! کہیں پتے جامنی کہیں زعفرانی. کہیں کھیت زیتونی یا دھانی. درخت تانبے کی طرح تپ کر بھڑک رہے تھے. بہت کم مقام ہیں. جہاں کائنات کے فنکار نے حسن کے تمام حربے استعمال کر ڈالے ایک طرف انگلستان کے بلند ترین پہاڑ جن پر دُور دُور برف کی سفید شہادتیں نظر آتی

ہیں اور اشجار سے ڈھکے ہوئے۔ چھوٹی بڑی سو سے اوپر جھیلیں۔ جن کے شفاف پانی میں اپنا چہرہ دیکھ کر میک اپ درست کرنے کو جی چاہے۔ ہزار ہا اقسام کے خودرو پودے، پھول بوٹے۔ جگہ جگہ نوکیلی گھاٹیاں۔ پوشیدہ وادیاں۔ جہاں انسان کم اور گلاب زیادہ۔ وحشی جانور تو شکاریوں اور شاہی خاندان کی نذر ہو گئے۔ اب ہرن، خرگوش، لومڑیاں، سرخ گلہریاں، پرند، مرغابیاں وغیرہ ہیں

کئی جگہ ایسے مقام آئے تھے کہ کار روک کر سانس روکنا پڑتا تھا۔ حسن اپنی پوری رعنائی میں نیم عریاں لیٹا ہوا ہے۔ نظر کی وسعت ہی آپ کو دغا دے تو آپ کی کم نصیبی، ورنہ جہاں تک دیکھ سکتے ہیں دیکھئے۔ کس سنگتراش کی چھینی اور کس چتر کار کا قلم ہو گا جو قدرت کے تین زاویے کو اس طرح پیش کر سکے؟ یہاں ننھے ننھے کلیسا بھی نظر آئے۔ یہ پادری بھی ہر مشکل جگہ مذہبی سرنگ لگا کر پہنچ جاتے ہیں اور سادہ لوح دیہاتیوں، پہاڑیوں کو اتوار کی وعظ دیتے ہیں۔ میری رائے میں تو یہاں رہنے والوں کو اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ جو جگہ یزدانِ کل کا عیاں عکس ہو جس کے ہر رخ سے خداداد حُسن کی شعاعیں پھوٹ رہی ہوں وہاں اندھیرے گرجے میں لا کر لوگوں کو کیا بتانا کہ خدا بھی ہے؟ ہم نے سب سے پہلے بڑی جھیل LAKE WINDER MERE کا قصد کیا۔ یہ جھیل کیا ہے؟ تقریباً ایک بالغ دریا ہے جہاں سٹیمر چلتے ہیں۔ ہم سے بہت پہلے یہ جھیل مصوروں کا مسکن تھی۔ قدرت کے نقالوں نے اس کے ہر لوٹے کو فیتے سے ناپ کر رنگوں میں اتارا۔ ہر مسکین گائے اور بھیڑ کو روک کر اس کی بھدی دُم سیدھی کرنی چاہیے۔ تاکہ فن میں بھی دم سیدھی نظر آئے۔ لیکن اب تو کاروں میں ہماری طرح سیاح بھرے ہوئے تھے۔ گلوں میں کیمرے دوربین اور جن کو پیسے کی نہیں وقت کی کمی تھی۔ لیکن ہمیں یہ جھیل ایک آنکھ نہ بھائی۔ وہی موڈرن تفریحات کے لوازمات۔ وہی کاروباری تفریح کے ٹکٹ، فوٹوگرافر، ہوٹ ڈوگ، آئس کریم کے بوتھ۔

اس جھیل کی روح تو بیسویں صدی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ دور دور اس کے قدرتی جوبن پر حکومت کی مقراض چلی۔ جب قدرت اپنی آزادی بیچ کر پالتو ہو جائے تو پھر مزہ نہیں آتا۔ میں

وہاں بچوں کے اصرار پر مشکل سے چند گھنٹے ٹھہری۔ ہماری اگلی منزل "گراس میئر" تھی۔ یہ جھیلی علاقے جن میں صحیح معنوں میں رومان تیر رہے تھے۔ پہاڑیاں پراسرار، وادیاں عمیق تر اور اوپر آسمان بادلوں کے گالوں میں اڑا چلا جا رہا تھا۔ جب سورج برآمد ہوا تو دونوں جھیلیں ایسی چمکیں کہ کالی عینکیں لگانی پڑیں۔ "گراس میئر" سارے علاقے کا سماجی مرکز ہے جہاں کھیل کبڈیوں اور کشتیوں کے مقابلے ہوتے ہیں۔ ساتویں صدی کا گرجا آثار قدیمہ میں سب سے نمایاں ہے۔ اردگرد کافی سخت جان پہاڑ ہیں جن پر کوہ رفتار اپنی زور آزمائی کرتے ہیں۔

گراس میئر کی سب سے خصوصی نمائش گاہ رومانوی تحریک کے ہادی کا گھر (DOY COTTAGE) ہے جہاں "ورڈز ورتھ" نے پہلے اپنی بہن اور پھر اپنی بیوی کے ساتھ زندگی کا بیشتر حصہ (۵۱ سال) گزارا۔ یہیں پر قریب کلیسا میں ان کی کتبہ کندہ قبریں بھی ہیں جہاں ہم نے اسی شاعر فطرت کی مغفرت کے لیے دعا کی اور اس بیچارے کو مغفرت کی ضرورت بھی بہت ہوگی۔ کیونکہ یہ قدرتی مناظر کے بیان میں، ایک پیغمبری حیثیت رکھتا تھا لیکن ......
اور اس "لیکن میں بہت کچھ پنہاں ہے۔ یہ شاعر زبردست اخلاقی ڈھکوسلہ تھا۔ پہلے اپنی محبوبہ کو فرانس میں دھوکہ دیا۔ پھر اپنے سیاسی دوستوں کو دغا دی۔ یہاں کے باسیوں کا دعویٰ ہے کہ "ورڈز ورتھ "تو کیا کسی" کور ذوق" کو لے آؤ تو اُنے ہی ایسے آفاقی حسن کے سامنے شاعر بن جائے گا۔ جب کوئی شخص "بدمست"، خود سے ہمکلام چلتا نظر آئے تو یہ دہقان زیر لب ہنستے ہیں کہ "اس کی بھی پتی اچھل آئی"۔ یہ حقیقت ہے کہ ان دلفریب نظاروں میں مجھ جیسی غیر شاعرانہ طبیعت کی بھی "پتی اُچھل آئی" لیکن افسوس! ان کوہساروں، چمن زاروں کو کون بیان کر سکتا ہے؟ قلم، رنگین مووی کیمرہ نہیں کہ جیتے جاگتے فوٹو اتار لے! اور گھر آکر دوبارہ پروجیکٹر پر طلسمی یادوں کو منعکس کرے۔

ہم نے اس تمام سفر میں ایک عہد کیا تھا کہ ہوٹل میں ہرگز نہیں ٹھہریں گے۔ چاہے کتنا سستا ہو۔ اس علاقے کے لوگ بہت مہمان نواز اور خلیق و سادہ بیچے انسان ہیں۔ گرمیوں کے

موسم میں جب سیاح شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھنا کر نکلتے ہیں تو یہ لوگ اپنے گھر کے در وا کر دیتے ہیں۔ صرف چھ سات شلنگ فی کس میں اچھے صاف کمرے اور گرم گرم صبح کا ناشتہ دیتے ہیں۔ اور پھر یہ جگہ ہوٹل کی مصنوعی گھٹن سے پاک ہے۔ دوسری رات ہم نے پڑاؤ "فیل اینڈ فارم میں ڈالا جو "کیزک" KESWICK کے قریب تھا۔ یہ ایک صاحب جائیداد کسان کا "کوٹیج" تھا۔ جس کے اردگرد اس کے کھیت اور ننھے باغیچے تھے۔ مالکن ایک موٹی مشفق اور معمر عورت تھی جس کے پانچ نوجوان بیٹے کھیتی باڑی کرتے تھے۔ کہاں ہمارے کسان کہاں یہ صاف ستھرا گھر! بلکہ دو گھر!! فرنیچر بھدا پرانا، لیکن مکمل اور صاف۔ ہمارے ساتھ راجہ صاحب بھی تھے۔ ان کے لیے ہم نے برابر کے "کوٹیج" میں ایک الگ کمرہ لے لیا تھا۔ لیکن وہ اپنے غیر معتبر دل کی وجہ سے اکیلے سوتے گھبراتے تھے۔ میں جب منہ دھو کر کمرے میں آرام کے لیے داخل ہوئی تو کیا دیکھوں کہ راجہ صاحب ایک بستر پر ناک تک چادر تانے دراز ہیں اس وقت وہ بالکل اس بھیڑیئے کی طرح لگ رہے تھے جو "ریڈ رائڈنگ ہوڈ" کی نانی کا سوانگ رچا کر پلنگ میں گھس گیا تھا۔ میں بچیوں کے کمرے میں چلی گئی اور یہ بزرگ ریاض صاحب کے ساتھ سوئے۔

ہمارے ساتھ ہلالی صاحب کا ولی عہد ناصر بھی تھا جو بہت پیارا اور چونچال ساتھی تھا اس غریب کے لیے کوئی الگ پلنگ نہ تھا۔ یہ پشت کے ہال میں صوفے پہ سو گیا لیکن اس کی قسمت میں چین نہیں تھا۔ ہمارے دہقان میزبان کی بھینس نے اسی رات بچہ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ساری رات وہ دردوں میں ڈکارتی رہی۔ پھنکاریں مارتی رہی۔ ناصر غریب کی پلک نہ جھپکی صبح کاذب ذرا آنکھ لگی تو کسان کے پالتو کتے نے منہ چاٹنا شروع کر دیا۔

صبح بقر عید تھی ہم سب نے نہا دھو کر نماز پڑھی۔ ایک دوسرے کے گلے ملے زرمبادلہ میں کم بخت عیدی دی۔ سب سے زیادہ چٹی راجہ صاحب پر پڑی کہ ہم سب ان کے چھوٹے تھے۔ ہماری مہربان میزبان نے ناشتے پر چھ قسم کے جیم جیلی (سب خالص گھر کے بنے ہوئے) شہد، مکھن، کرارے توسٹ، دودھ انڈے، کیک، چائے، پھل سجا دیئے۔ میز بھر گئی مگر

ہماری نیت نہیں بھری. چلتے وقت سارا بل کل ڈیڑھ پاؤنڈ تھا. بڑی بی نے بچوں کے نصف دام لگائے. ناصر ساری رات بھینس کا زچگی میں ساتھ دے چکا تھا. صبح بھنا یا ہوا تھا. جب کار چلی تو کچھ دور جاکر بولا" اختر آپا. آج بقرعید ہے اور خاص اس موقع پر اس سارے فرنگی فریب میں ایک مسلمان نہیں جو قربانی دے. اس ننھی سی جھیل پہ کار روک کر ذبح کردوں"

میں نے کہا" کسے؟"

بولا" بھینس کے بچے کو"

میں نے سوچا کہ ہر مشہور جھیل تو دیکھنی ناممکنات میں سے ہے. قوانین کائنات بھی چناؤ پر مبنی ہے. چھانٹو اور دیکھو. اس پہ بھی آٹھ نو ٹپاؤ ہو گئے" لیکن" ہم گھومے، کچھ ٹائروں پر، کچھ ٹانگوں پر. کئی گوشوں میں ایسا سکون تھا کہ گویا یہ چیدہ چیدہ نیک روحوں کا مسکن ہے، جو بادلوں کی طرح حسن اور خاموشی میں جذب ہو جاتی ہوں۔

گذشتہ زمانے میں یہ علاقہ دو یادوں کے ساتھ وابستہ تھا. ایک تو اس کی گھوڑا گاڑیاں جن کو محبتاً" کوچی" COACHEES کہا جاتا تھا. ان کے ڈرائیوروں کی پھکڑ میلے بازیاں ایک کہاوت بن گئی ہیں. دوسری وابستگی اس علاقے کو" کولرج" سے ہے جو اپنے ننھے بیٹے اور شریک حیات کے ساتھ" گریٹا ہال" میں عرصے تک مقیم رہا. اسی دوران میں کئی شاعر اور مصنف آتے جاتے رہے جس سے اس کا نام" آنٹی ہل" پڑ گیا" آلز واٹرز ULLS WATERS انگریزی جھیلوں میں سب سے زیادہ" نیک خصلت و خاندانی سمجھی گئی ہے اس کے تینوں راستے پرامن ہیں. اس کی چراگاہوں میں گلے منہ جھکائے اس سکوت سے چر رہے ہوتے ہیں کہ پکچر پوسٹ کارڈ معلوم ہوتے ہیں. یہاں کے پانی دن کی روشنی کے ساتھ ساتھ اپنے کئی رنگ بدلتے ہیں. یہاں گھاس پر چلنے کو دل نہیں چاہتا کہ کہیں یہ زمردیں زیست پامال نہ ہو جائے. یہ علاقہ اپنی" صدائے بازگشت کے لیے مشہور ہے. کوئی پٹاخہ کوئی دھماکہ ہو دیر تک پہاڑ تو بجتے رہتے ہیں. اس شور سے سنا ہے کہ وہاں کی جنگلی مرغابیاں

اپنے مانوس پانی چھوڑ کر کہیں اور چلی گئیں. کئی سانڈ اپنی ڈکار کی گونج سُن کر پاگل ہو جاتے ہیں. واللہ اعلم ،،

''ڈرونٹ واٹرز DERWENT WATERS کے کنارے پر ہم نے آدھے دن پکنک کی، خوب تیرے. اس دن سورج خوب جوبن پر تھا، ایک دوسرے کی پانی میں خوب گت بنائی. راہرو بہت کم. ہماری ''شیورلے'' کار اس سادہ ''جھیلی علاقے'' میں ایک عذاب جان تھی.

سارا کنبہ معہ سامان کے آرام سے آجاتا تھا. لیکن وہاں کے سادہ لوح باشندے ''شیورلے'' کے تازہ ترین ماڈل سے ناواقف تھے. آتے جاتے ہم سے اس کی رونمائی کرواتے. فرمائش ہوتی اس کا انجن کھول کر دکھاؤ کیسا ہے. ادھر راجہ صاحب نے میری چڑ بنالی. میں جب وجد میں آکر ''ایک شاعرون'' کی نظمیں دہراتی تو وہ اپنے مخصوص لہجے میں رچیے وہ میرے لیے جان کر اور کرخت بناتے تھے HOME HOME SWEET HOME گانے لگتے تھے. اس لہجے کا انگریزی میں ترجمہ کیا جائے گا تو یہ ہوگا HOME HOME SAVEET HOM خیر یہ میری نازک مزاجی کی سزا تھی. ان کائناتی وسعتوں میں جہاں شاعری پروان چڑھی. راجہ صاحب جیسے مسخرے ہم سفر بنے. اس سارے سفر میں ایک بات کا احساس ہوا. وہ یہ کہ اس علاقے کی بارش ایک ''آفاقی شخصیت'' ہے جس میں زندگی جیسا تنوع ہے. ہر دفعہ اس کے رنگ بدلتے رہتے تھے. کبھی سیپ کی طرح دبی دبی دمک کبھی ملتانی مٹی کی طرح مٹیالی مہک. کبھی سفید کبھی سلیٹی یہ آبی آسیب کبھی پیچھے پیچھے چلے. پھر ایک موڑ پر ہم سب سے آگے پھر رک گیا. پھر دھوپ میں سے چھن چھن کر برسنے لگا. پھر غائب. ہم نے کہا. اس کے پینترے سیاسی ہیں. اس کو ووٹ ملنا چاہیئے. شام کو ذرا تازہ دم ہو کر چلیے پی کر باہر نکلے، تو قریب ہی ایک گاؤں میں آتش بازیاں چھوٹ رہی تھیں. ہم ٹہلتے ٹہلتے پہنچے. وہاں دیہاتی میلہ تھا ہم لوگ تفریح پر تُلے ہوئے تھے ''ڈوجم DODGEMS میں

ریاض صاحب اور بچیوں نے خوب دنادن ٹکریں لگائیں "گھومتے گھوڑوں" پر بیٹھے۔ مشینی جوا کھیلا جس میں راجہ صاحب پیش پیش تھے۔ پھر نشانہ بازی کا سٹال نظر آیا پانچ نشانوں میں اگر سب مصنوعی خرگوش اڑ جائیں تو انعام۔ راجہ صاحب کے دو خطا ہوئے۔ ریاض صاحب کا ایک، میرے پانچوں خرگوش گولی کھا گئے۔ دونوں مرد بہت کچے ہوئے۔ جتنا وہ بات اڑانا چاہیں میں اتنا ہی چڑاؤں۔ جب انعام میں شیونگ کریم نکلی تو پھر میری شامت آئی۔ سامنے کونے پر جو نظر پڑی تو ایک سکھ شاہی پگ چوڑیاں بیچ رہی ہے۔ آواز آئی "بھین جی آپ کو تو ضرور پہنانی ہیں"۔ یارب یہ سکھ اس علاقے میں بھی اپنی "دہی آلود" ڈاڑھیاں لے کر پہنچے ہوئے ہیں۔ ان سے کہاں مفر ہوگا؟ ہمارا آخری پڑاؤ "بٹرمیر" BUTTERMERE پر تھا۔
یہ جھیل بستی سب سے چھوٹی۔ سب سے تنہا۔ سب سے سحر انگیز!!! دُور دُور گھنے درختوں کی سازشوں میں اکا دکا خیمے جن میں حسن و عشق ہم آغوش لیٹے تھے۔ آفتاب اپنی آخری حدت ہار چکا تھا۔ سائے ڈھلنے شروع ہو گئے۔ سامنے پہاڑیوں سے جھرنوں کی قل قل۔ میں نے اتنے سریلے آبشار کبھی نہیں سنے۔ دائیں طرف نباتاتی انبار جن میں سے عجیب نوح کی ہلکی ہلکی مہک آرہی تھی۔ غالباً کوئی بیل یا بوٹی اپنا معطر راز افشا کر رہی تھی۔ جھیل کے بے بل آئینے میں آسمان جھانک رہا تھا۔ یک لخت کہیں سے ہوا چلی اور ہلکا ہلکا سا ہیجان برپا ہوگیا ڈوبتے سورج کے شہتیر پانی پر برسنے لگے۔ آنکھوں میں ترمرے ناچنے لگے۔ موج اور کرن میں تمیز مشکل ہو گئی
اس ڈلک ڈلک کرتی جھیل کے ریتیلے حاشیوں پہ بادامی پام جن کے لمبے لمبے گوش پانی پر آویزاں تھے۔ اس جلوے کے رعب سے میرا سانس بند ہوگیا اور آنسو جاری ہو گئے۔ اس وقت خالق اور کائنات میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اس یزدانی حُسن کے سامنے نہ انسان یاد آیا، نہ اس کے مظالم۔ نہ معرکے نہ معاشقے۔ میں اکیلی دیر تک عبادتِ حُسن میں محو رہی "ورڈسورتھ" کی سطور جن کو میں نے بارہا پڑھا اور سنا تھا:

I HAVE FELT A PRESENEC

THAT DISTRUBS ME WITH THE JOY OF ELEVATED THOUGHTS.

A SENSE SUBLIME OF SOMETHING FAR MORE DEEPLY INTERFUSED WHOSE DWELLING IS THE LIGHT OF SETTING SUNS ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ "

میں نے پہلی دفعہ سمجھا۔

لندن کا دوسرا رُخ : ستمبر ۱۹۶۵ء

اس دفعہ لندن وہی تھا لیکن میں بدلی ہوئی تھی۔ اپنی جنگ نے تو دل و دماغ ماؤف کر دیئے تھے۔ میں نے اپنے پرانے فلیٹ کو بک کرالیا تھا۔ لیکن میری مخلص سہیلی بیگم ہلالی نے مجھے وہاں رہنے نہ دیا۔ حالانکہ ان کا گھر دھرم شالہ بنا ہوا تھا۔ سب پاکستانی سیاحوں نے وہیں آسرالیا تھا سب کے خیالات پر اپنا وطن چھایا ہوا تھا۔ صرف میری سہیلی کے نقرئی قہقہے ہم سب کی ہمت اور امید لوٹنے نہیں دیتے تھے۔ لندن کی مجموعی فضائیں بہ نسبت امریکہ کے زیادہ دوستی تھی اخبارات۔ ٹیلی ویژن رسوائے خالہ بی بی سی کی ادلین زیادتی کے، ریڈیو دونوں رُخ پیش کرتے تھے اور جب کوئی مغربی ملک غیر جانبدارانہ انصاف کرے تو یقیناً وہ ہمارے حق میں بولتا ہے، کیونکہ ہمارا CAUSE ہی ایسا ہے۔ ٹیلی ویژن کے "پینو راما" PANO RAMA نے ہماری ساری جنگ لاہور سے سیالکوٹ اور اکھنور تک دکھائی لیکن ہندوستان کے ایک محاذ پر بھی اسے جانے کی اجازت نہ ملی۔ ادھر ہمارے سپہ سالار سے لے کر ادنیٰ سپاہیوں تک گفتگو سنائی۔ ادھر ایک "انڈین ایکسپریس" کا کٹر مدیر دوسری مادام وجے لکشمی پنڈت بمعہ اپنے گیسوئے رسمیں فرماتی ہیں کہ مجھے حیرت ہے کہ مسٹر ولسن نے پاکستان کی بلا تکلف حمایت کیسے کی؟ ہم ہر اس قدر کے علمبردار ہیں جن پر برطانیہ ایمان رکھتا ہے۔ مثلاً۔ جمہوریت" لبرل ازم"

غیر جانبداری. پاکستان تو ایک فرسودہ "مخیا کرہ بن" ہے. کنگزلے[1] مارٹن، تایازنکن[2]، اٹیلی[3]، میلکم میگرج[4] کیٹلے[5]. گرگس[6]. ہیوٹنکر[7] جیسی نمایاں شخصیتوں کے مباحثے ہوئے جن میں ہمیشہ فیصلہ پاکستان کے حق میں ہوا۔

کومن ویلتھ سوسائٹی کی مجلس میں ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس میں پاکستان کے تین سابقہ انگریز. کمشنر اور افسران تھے. پاکستانی خصوصاً طلبا قومی جوش سے پھنپھنا رہے تھے. لندن کے مسلمانوں نے حسین دریا دلی سے چندہ دیا اور جن جذبات کا اظہار کیا وہ ناقابل فراموش ہے. طلبا کا بس نہیں چلتا تھا کہ اپنے تعلیمی پنجروں کو توڑ کر اپنی سرزمین پر پہنچیں. شیروں کی طرح ٹہلتے اور غراتے تھے لیکن بے بس تھے. مسلمان ہوٹل والوں نے اپنی حُب الوطنی کا ثبوت طعامی قسم کا دیا INDIAN CURRY پر یوں X نشان لگا دیا. مجھے اس زمانے میں نہ کھانا ہضم ہوتا نہ دودھ. دماغ میں تشنج اعصابی ڈھیر ہو گیا. بار بار یہی سماں آنکھوں کے سامنے آتا کہ خدا نہ کرے اگر ہمارے لاہور کو کچھ ہو گیا تو لارنس گارڈن میں سکھ اپنی زنبیں کھول کر کڑاہ پرشاد کھا رہے ہوں گے. اس وقت دوست رشتہ دار سمٹ کر صرف ایک نقطہ بن گئے تھے. وہ تھا لاہور. وہ چلا گیا تو پھر ماتم کس کا کریں گے؟ روز صبح اندھیرے چار بجے ہلالی صاحب کے چیخنے کی آواز آتی تھی. ٹیلی فون پر پنڈی سے تازہ ترین احکامات صادر ہوتے تھے. میری سہیلی کا یہ سب خبریں سُن کر پیٹ پھولتا تھا. فوراً میرے کمرے میں آ کر بتاتی تھیں اب یہ ہوا، اب وہ ہوا. وہاں مات دی، وہاں مات کھائی. ہلالی صاحب چومکھی لڑ رہے تھے. ایک طرف چھوٹے بڑے پاکستانیوں کی خاطر مدارت، دوسری طرف لندن کے طلبا کو پچکارنا

---

[1] KINGSLEY MARTIN [2] TAYAZINKIN [3] ATTLEE

[4] MALCOLM—MUGGERIDGE [5] KEIGHTLEY

[6] DRIGGES [7] HUGHTINKER

ادھ سب فائربندی کے خلاف تھے ادھر انگریز صحافیوں کو مدعو کرنا۔ اپنا مسئلہ سمجھانا۔ پھر سارے سفارتی فرائض انجام دینے۔ مختلف ہالوں میں تقریر کرنی۔ بیچارے کی حالت قابل رحم تھی۔

یہ لندن جو میرا جذباتی جنون تھا۔ اس لندن میں کچھ کرنے کو دل نہ چاہے بجز "ہائیڈ پارک" کے گھنے درختوں کے نیچے بیٹھ جاؤں اور سوچوں کہ اللہ یہ جنگی اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ ریاض صاحب پنڈی جاچکے تھے اور میں امریکہ سے بچیوں کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ جب فائربندی ہوئی تو نہ رو سکوں نہ ہنس سکوں۔ صرف خدا سے دعا مانگی کہ "یا اللہ جو بھی ہو بہتری ہو۔" ذرا اعصابی تناؤ ڈھیلا ہوا تو مسنر ہلالی کے مہمان سب رخصت ہوئے۔ اوسان ٹھکانے آئے تو میں نے کہا کہ اب ذرا لندن سے مل تو لوں۔ پچھلی کسر نکالنی تھی۔ جی بھر کر یورپ کی درجن بھر کلاسیکی فلمیں دیکھیں۔ تھیٹر دیکھے۔ چیخوف کے ڈرامے میں "انگمرڈ برگمن" کو سٹیج پر دیکھا۔ کم بخت پچاس کی تھی۔ پھر بھی اس طرح پر شباب کہ ننھیڑی خورد بین لگا کر دیکھنے پر بھی ایک جھری یا حلقہ نظر نہیں آتا! کیا شخصیت ہے؟ کیا اداکاری ہے! ایک ہردلعزیز سیاسی ہجو دیکھا جو کئی سال سے چل رہا ہے۔ یہ صرف اوکسفورڈ کے چار طلبا پیش کرتے ہیں۔ اس میں برطانیہ کے ہر متبرک ادارے کا خاکہ اڑایا ہے۔ وہاں کے ریلوے کرکٹ، جنگ، دولتِ مشترکہ، وزیراعظم "نے تو"۔ جمہوریت، حتیٰ کہ ان کے دو مسجود ملکہ اور شکسپیئر کا بھی۔ ہنستے ہنستے دوہرے ہوگئے یہ ابھی تک چل رہا ہے۔ ہر نئی وزارت کے ساتھ نام بدلتے جاتے ہیں۔ میری قسمت سے اس زمانے میں دولت مشترکہ کا جشن COMMON WEALTH ARTS FESTIVAL بھی شروع ہوگیا۔ ہر ملک اپنے فنون اور ترقی کی نمائش کر رہا تھا۔ ہمارے خٹک رقاص اور نزاکت علی سلامت علی نہ پہنچ سکے۔ آخرالذکر کی غیر حاضری پر میں نے اطمینان کا اظہار کیا۔ ہمارے کلاسیکی گویے مغرب میں نہیں چلتے۔ وہاں ان کے تان پلٹے صرف صوتی نٹ بازی یا جمناسٹک معلوم ہوتے ہیں البتہ ستار اور سرود رنگ جمالیتا ہے گلا نہیں۔ افریقہ سے نہایت دلچسپ ٹیمیں آئی ہوئی تھیں "سی ایرالیون" کی عریاں تنومند خواتین تین چوتھائی بینڈ کی ناظم تھیں۔ ان

کی کوئی رقاصہ پندرہ سال سے اوپر نہیں تھی۔ ان کی چکنی چکنی برہنہ آبنوسی جلد ہال میں چمک رہی تھی اور بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی۔ اس مکمل عریانی پر انگریز ناظرین نے پلک بھی نہ جھپکائی۔ ملکہ بھی بمعہ اپنے دربار کے مزے لیتی رہی "ویسٹ انڈیز" "کالم بو" LIMBO رقص ایک کرشمہ تھا چھریرے بدن کا حبشی دونوں کاندھوں پر شمع جلا کر ناچتے ناچتے دس انچ زمین سے اونچے رسے کے نیچے سے نکل جاتا تھا۔ جسم تھا کہ حریر، جدھر مرضی مٹھی میں دبا لو۔ لنکا کے تامل جھامی رقاص بھی تھے۔ جنھوں نے "ہاتھی ناچ" پیش کیا۔ محض بوگس!! پاکستان ہندوستان کی صنعتوں کے سٹال بالکل ساتھ ساتھ تھے۔ پہلے ملکہ اور ان کا (لمبا اور بونگا) شوہر ہمارے سٹال پر آئے۔ سب ان کو چیزیں بتائیں دکھائیں۔ جب ہندوستانی سٹال کی طرف بڑھے تو ڈیوک مڑ کر پوچھتا ہے "اجازت ہے فائر بندی کی حد پار کرنے کی"

ایک دن شام میں نے صرف دولت مشترکہ کے مصوروں اور ان کے فن کے ساتھ گزاری وہاں شہزادی مارگریٹ سے ملاقات ہوئی۔ فوٹو سے کہیں زیادہ خوبصورت، بوٹا سا قد، ہلکی گلابی جلد۔ بڑی آسمانی آنکھیں جن میں فانوس جل رہے تھے۔ مجھے بہت پسند آئی ملکہ کی بہن نہیں معلوم ہوتی تھیں۔ یوں احساس ہوتا تھا کہ ان کی والدہ محترمہ نے یورپ کی سیر لمبی کی ہے انگلستان میں عورت یا تو بالکل سفید ہے یا اتنی سرخ کہ لگتا ہے خون پھٹ گیا۔ دنیا میں دو ہی رقص روحانی ہیں۔ ایک مغربی بیلے، دوسرا بھارت ناٹیم۔ اس ہفتے یامنی کرشنا مورتی کا بھی پروگرام تھا۔ جب پہنچی تو بتیاں مدھم ہو رہی تھیں۔ سٹیج پر یامنی کا مدراسی گرو انگریزی میں تقریر کرنے لگا "ہم ہندوستانی حسن۔ شاعری۔ انصاف، امن کے پجاری ہیں۔ کالی داس نے کہا ہے کہ ہمالہ ہندوستان کا لجا مد قہقہہ ہے" پیچھے اندھیرے سے آواز آئی۔ "جلد ہی چین اس کو پگھلا دے گا!" سب بے ساختہ ہنس دیئے۔



میکسیکو

میکسیکو

ہالی وڈ کی رسی دراز ہو کہ جس نے "کارمین میرنڈا" کو نیم برہنہ لباس پہنایا اور بالوں میں کیلے، انگور لٹکا کر "چاچا بوم چک" نچایا۔ بچپن میں ہم نے سمجھا کہ یہی لاطینی امریکہ کی نمائندہ ہوگی۔ پھر جوانی میں ٹائم میگزین پڑھی تو خیال کیا کہ یہی لاطینی امریکہ وہ نقطہ ہے جہاں سیاسی عہد مختصر اور دوپہر کی نیند دراز ہوتی ہے۔ بہرحال یہ براعظم ہمیشہ سے ایک آرزو تھی لیکن جب موقع ملا تو اتنی عقل آئی کہ یہ "برا" جتنا کشادہ ہے ہمارا بٹوہ اتنا ہی تنگ ہے۔ اس لیے قرعہ ڈالا ہوگا کہ کس ملک کو دیکھیں۔ پرچی نکلی "میکسیکو کے نام کی ہمارا جغرافیہ ہمیشہ سے کمزور تھا نقشہ اٹھایا تو معلوم ہوا کہ میکسیکو تو وہیں تھا جہاں ہم بیٹھے تھے۔ ہم شیخ چلی نہیں ہیں ذرا سمجھنے کی بات ہے ہم اس وقت کیلیفورنیا (CALIFORNIA) میں تھے اور پچھلی صدی میں یہ میکسیکو کا حصہ تھا۔ لیکن شمالی ٹیکساز (TAXAS) کے لیٹرے سپاہیوں نے نہ صرف کیلیفورنیا بلکہ جنوبی ٹیکساز اور ایری زونا کو بھی دھاندلی میں چھین لیا۔ میکسیکی تاقیامت امریکہ کو یہ ڈاکہ معاف نہیں کر سکتے۔ ان کا نقشہ ایک تہائی سمٹ کر چھوٹا ہو گیا۔ آج جب وہ ٹیکساس کا تیل اور کیلیفورنیا کے باغات، زراعت اور عمارت دیکھتے ہیں تو ان کے سینے پر سانپ لوٹتا ہے۔ افوہ! میں بھی کہاں سے کہاں بھٹک جاتی ہوں۔

غرضیکہ قرعہ میکسیکو کے نام پڑا اور ساری زندگی ہم کو اس قرعے سے شکایت نہ ہو گی جب نیک امریکن مرتے ہیں تو پیرس جاتے ہیں جب میں مروں تو ایک دفعہ میکسیکو

ضرور بھیجی جاؤں۔ بہت کم مقامات کو دوبارہ دیکھنے کی اتنی شدید تمنّا ہے

ہمارا طیارہ رات کے نو بجے دارالسلطنت "میکسیکو سٹی" پر منڈلانا شروع ہوا۔ بتیوں سے اندازہ ہوا کہ شہری نقشہ میں اگرچہ ترتیب اور دانشگی ہے۔ مگر پھر بھی ایک ہلکی جذبیت کی بھی ہے۔ ہوائی اڈے سے ہوٹل تک یوں محسوس ہوا کہ مشرقیت قریب آگئی ہے۔ سیاہ بال بھوری یا کالی آنکھیں۔ اکثر گندمی رنگتیں۔ مانوس بے تکلفی۔ مانوس بد انتظامی، مانوس لاپرواہی غسلخانوں میں فنائل اور ٹائلیٹ پیپر عموماً غائب، اہلکاروں میں کاہلی۔ فرنیچر پر دھبے اور مٹی۔ باہر نکلو تو جانی پہچانی غربت (لیکن اس غربت کا پھر بھی ہماری غربت سے کوئی مقابلہ نہیں، میکسیکو فی کس شرح آمدنی کے لحاظ سے ہم سے بہت آگے ہے)

امریکہ کی امارت اور سرد مہری کے بعد میکسیکو اور بھی مانوس اور نیم مشرقی معلوم ہوا۔ اپھر اس کی فضا زندگی کی رفتار امریکہ سے کس قدر مختلف ہے۔ یہاں سڑکوں پر لوگ چل رہے تھے بھاگ نہیں رہے تھے۔ یہاں کاروں میں قیامت کی بھگدڑ نہیں تھی۔

خوب گھومنے کے بعد شہر کا نقشہ بھی کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا۔ یہ شہر جتنا بڑا ہے اتنا ہی ایک سیاح کے لیے آسان بھی ہے۔ جب تک کوئی جہاں دھونہ ہو یہاں کھویا نہیں جاتا۔ بہت کم شہروں کی ترتیب میں تاریخ نے اتنا موثر حصہ لیا ہے۔

سات ہزار فٹ کی نیم برفانی بلندی پر حکومت کا یہ مرکز ہمیشہ سے خوش قسمت رہا ہے دنیا کے دارالحکومت کئی بار بنے اور بگڑے۔ ہماری دلی ہی کو دیکھئے کہ بیچاری سات بار اجڑی اور بسی۔ لیکن میکسیکو سٹی کی یہ خوش بختی تھی کہ اسے ہر عہد میں مہذب اور باذوق حکمران ملے جنہوں نے گذشتہ کو منہدم کرنے کی بجائے آئندہ کو آراستہ کیا۔ اس شہر کی تولید حُسن پرست ازٹک قبائل کے سرداروں کے ہاتھوں ہوئی۔ انہوں نے اس کی جھیلوں کے کنارے اپنے محلسرا اور تکونے مندر بنائے۔ اس کے پانیوں میں ازٹک امراء کے شکارے پھولوں اور طلائی گھنٹیوں سے مسجع ڈولتے رہتے تھے۔ ہسپانوی فاتح کورتے نے اس شہر کو "نئی دنیا کے وینس" (NEW WORLD

VENICE کا لقب دیا تھا۔

ہسپانوی عہد ہی میں اٹلی، فرانس اور اسپین سے مشہور معمار بلائے گئے۔ جنہوں نے اس شہر کو تین صدیوں تک بلند کاخ و کلیسا سے آراستہ کیا۔

انیسویں صدی میں کچھ عرصہ کے لیے فرانسیسی بادشاہ "میکسی ملین MAXI MILLIAN بھی انگلی کٹوا کر شہیدوں میں شامل ہوگیا۔ اس کی جامہ زیب ملکہ کو اپنے خاوند سے عشق تھا اس لیے اس نے میکسیکو کی مشہور شاہراہ "ریفارما" REFORMA بنوائی جو سیدھی محل پر جا کر ختم ہوتی ہے تاکہ وہ اپنے مجازی خدا کو دُور ہی سے آتا جاتا دیکھ سکے۔ ہمیں کچھ شک گذرتا ہے کہ اس کی وجہ شاید کچھ اور ہی ہو۔ رومن امرا اس معاملے میں بیویوں کا بہت پاس رکھتے تھے۔ آنے سے پہلے ہمیشہ ایلچی بھیج کر اپنی بیویوں کو خبردار کر دیتے تھے۔

غرضیکہ صدیوں کے استعماری راج کے خلاف قومی جذبہ بھڑکا۔ بہت طویل اور روح فرسا خانہ جنگی کے بعد میکسیکن باشندوں نے بیرونی سامراجیت کا بوریہ بستر باندھ کر باہر پھینکا۔ اور ۱۸۲۳ء میں ایک آزاد ری پبلک قائم کی اور حکومت کی باگ ڈور خود سنبھال لی خاصے عرصے تو باری باری لیڈر آئے۔ صدر بنے۔ اچھا یا برا آئین قائم کیا۔ ۱۹۱۷ء میں آخر ان بدبخت عوام نے "اصلاحی آئین" CONSTITUTION REFORMA حاصل کیا لیکن پھر بھی مکمل جمہوریت اور مساوات کا سہرا "کارڈناز" CARDENNAS کی زرعی اصلاحات کے سر رہا جس نے چالیس فیصد کسانوں کو دوبارہ اراضی کی ملکیت دلوائی۔

پچھلے تیس سال میں میکسیکو نے سیاسی استحکام حاصل کیا تو دارالسلطنت کی قسمت اور بھی چمک اٹھی۔ اپنے ماہر فن کو جو "یونیسکو" UNESCO کا سابقہ ڈائریکٹر جنرل بھی رہ چکا ہے وزیر تعمیرات بنایا۔ اس وزیر نے میکسیکو کے آثار قدیمہ کو ایک نیا سہارا دیا اور جدید تقاضوں پر پورا اترنے والے شہر کی بنیاد ڈالی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میکسکو کے نصف حصے کی پُشت بھاری ہے اور بقیہ نصف مستقبل کا آئینہ دار ہے تاریخ اور جدید تنوع بیک وقت سانس لے رہے ہیں۔

لاطینی امریکہ کی نمایاں فلک بوس عمارات یہاں پر بھی ہیں. لیکن امریکن "سکائی سکریپر" کی
طرح نہ اتنی بلند نہ اتنی یکساں. چتر کاری کے چار دیوتا ڈول SEQVIROS, GORMAN, DIEGO
RIVERA, OROZCO نے ہر اہم عمارت کے ماتھے پر، بازو پر، قدِ آدم "میورل" بنائے ہیں
ان میں ہزاروں رنگوں کو ترتیب دے کر میکسیکو کی تاریخ کے یادگار منظر منقش کئے گئے ہیں.
ان "میورلز" نے میکسیکو سٹی کو دنیا کا سب سے اچھوتا شہر بنا دیا ہے ان کو دیکھ کر عوام جمالیاتی
فن سے آشنا اور قومی افتخار سے لبریز ہوتے ہیں. تعلیمی وزارت اور مرکزی سیکرٹریٹ کے
میورل کیتھولک چرچ کا علانیہ ہجو ہیں. ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح مذہبی منادوں نے
مزدوروں کی ہڈیوں کو پیس کر اپنے اہرام انا ساخت کئے تھے اور پھر اس پر سونے کا ملمع کرتے
تھے. کس طرح وہ عوام کے حقوق بادشاہوں کے ہاتھ نیلام کر کے ان کی قربت اور خوشنودی
حاصل کرتے تھے زیادہ تر میورل انڈین قبائل کی ابتدائی تاریخ ثقافت ہیں. بعض میں
ازٹیک دور کی رسومات اور فصلی جشن. بعض میں سامراجی عہد کے مظالم چند میں آزادی کی
جدوجہد اور زندہ جاوید میکسیکو کی تازہ امنگیں.

اگر میکسیکو کے مورخ مٹ بھی جائیں تو یہ میورل ان کے اوراق کی مکمل شہادت ہیں.

میکسیکو شہر خطِ استوا کے شمالی قرب میں ہے. اس لیے اتنی بلندی کے باوجود اس کو وہ موسم ملا
ہے جس کو "ابدی بہار" کہتے ہیں. سدا ہری گھاس. ہرے بھرے درخت جو جاڑوں میں بھی اپنے
پتے نہیں جھاڑتے. اس کی فضا میں عجیب قسم کی دمک اور گرارہ پن ہے. یہاں ہر روز ایک
ناقابلِ یقین کرشمہ دیکھنے میں آتا ہے. جسے پہلے پہلے تو میں نے نہیں مانا. پھر کئی دن دیکھنے کے
بعد اس پر ایمان لے آئی. وہ یہ کہ مئی سے اکتوبر تک یہاں ہر روز چار بجے کے قریب پھوار
پڑتی ہے. ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ٹیلیفون پر ۰۴ سے پوچھ کر عین مقررہ وقت پر آتی ہے
اور چھ بجے تک غائب ہو جاتی. مجھے کبھی گمان نہیں گزرا تھا کہ بارش کی دیوی بھی ہم مجبور
انسانوں کی طرح وقت کی مقید ہو سکتی ہے

شہر کا ظاہری شور و شغب جب ذرا ہلکا ہوتا ہے تو اس کا باطن آہستہ آہستہ ابھرتا ہے کسی بھی ملک کے انسان اس کی اصلیت ہوتے ہیں. ہوائی اڈے پر یا ہوٹلوں میں جو نمونے نظر آتے ہیں ان کی پلاسٹک کی مسکراہٹیں ہوتی ہیں. مصنوعی پلکوں کی طرح چھپا کے میں اترتی چڑھتی رہتی ہیں. لیکن سڑکوں پہ ٹہلتے ہوئے, باغوں میں لیٹے . زمین دوز مرمتوں میں جتے ہوئے. دیہاتوں سے پوٹلے اٹھائے اور جھٹکے کھاتے ہوئے, تین تین بچوں کو کندھوں پر اٹھائے گاتے ہوئے جو لوگ دکھائی دیتے ہیں وہ ہیں کسی شہر کا باطن. میکسیکو کا باطن خوش مزاج نظر آیا. یہاں عام لوگ غیر مانوس چہروں خصوصاً عورتوں کو دیکھ کر مسکراتے ہیں. شرماتے اور سراہتے بھی ہیں. بعض وقت سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ مسکرا کر مذاق اڑا رہے ہیں یا داد دے رہے ہیں. میری ساڑھی سے کچھ زیادہ عجوبہ ان کے لیے بچیوں کی شلوار قمیض تھی. کئی جگہ تو ٹھٹھ لگ جاتے تھے اور جب قریب جاؤ تو گردن ڈال نیچی نظر کر کے الگ.

ہسپانوی خون کے باعث ان میں "شی ولری" CHIVALRY نمایاں ہے. مگر انڈین قبائلی جھجک اور حجاب بھی شامل ہے. دیہاتوں کی بیروزگاری دیہی آبادی کو شہروں کی طرف دھکیل رہی ہے. اس لیے ہر قدم پہ آپ کا تھیلا اٹھانے کے لیے چار مزدور تیار ہیں. بھکاری بھی ہیں مگر خاموش. آپ کی بوٹیاں نہیں نوچتے. اسی لیے اس ملک میں خیرات دینے کو میرا دل چاہتا تھا. بوڑھی عورتیں جگہ جگہ لاٹری بیچ رہی ہیں. بوڑھے بوٹ پالش کرتے ہیں.

عورتوں میں حسن جہاں بھی نظر آئے سمجھ لیجئے یہ ہسپانوی خون کا اثر ہے. یہاں چپٹی ناک. چندھی آنکھ یا سپاٹ پیشانی نظر آئے تو سمجھو کہ انڈین رگ پٹھے غالب آگئے ویسے شدھ خون کہیں نہیں ہے. ہماری طرح نسلی سلاد ہے. کوئی کسی کھیت کی مولی کوئی کسی کھیت کی, نہ خالص ہسپانوی نہ خالص انڈین سب "میس تیزو" MESTIZO ہیں ہماری رگوں میں بھی کہیں ترکی. کہیں تاتاری. کہیں ایرانی. کہیں یونانی, کہیں عربی. کہیں

چٹنی، کہیں دراوڑی، کہیں آریائی خون بہہ رہا ہے۔ ہمارا تجزیہ کرتے کرتے ماہر علم بشر خود سکون حاصل کرنے کے لیے پاگل خانے میں گھس جائے۔

میکسیکی لوگ ایک تو آپ سے "نہ" بہت کم کہیں گے۔ یہ جھوٹ کی عادت نہیں ہے۔ محض وہ آپ کا دل نہیں توڑنا چاہتے۔ غلط پتہ بتا سکتے ہیں۔ لیکن ایسی بدتمیزی کبھی نہیں کریں گے کہ کہہ دیں اگر "مجھے معلوم نہیں"۔ بنا چہ علامہ آداب کے مالک ہیں۔ لیکن ان کی یہ شائستگی کم از کم مجھے کو نوا کر دیتی تھی۔ پوچھو کچھ بتاتے ہیں کچھ۔ بہت دھکے کھلوائے۔ وہ تو شکر تھا کہ ٹیکسی کچھ سستی تھی۔ ورنہ قیامت آ ہی جاتی۔

میں چٹوری نہیں ہوں۔ لیکن امریکہ میں مغربی کھانے کھا کھا کر۔ ہاں کچھ ایسی لیس دار ہوئی کہ مجھے کچالو اور دہی بڑوں کے روزانہ اتنے خواب آئے کہ تکیہ گیلا ہو جاتا۔ میکسیکو پہنچتے ہی پہلی رات گیارہ بجے ایک ریستوران پہنچی جیسے ہی سامنے میری نظر ہری مرچ، ٹماٹر، پودینے کی چٹنی پر پڑی، جو لپک کر گری تو جب تک پورا کھانا میز پر آتا۔ زبان سن ہو چکی تھی۔ یہاں کی مرچیں تنتیا ہوتی ہیں۔ سب پچھلے قرضے پورے ہو گئے۔

ان کا "تورتا" ایک بے ہنگم لفظ ہے۔ جس میں بہت سی چیزیں سما جاتی ہیں۔ یہ اصل میں تو چھوٹے سخت چھلکے کی طرح ہوتا ہے اور پکایا بھی توے پر جاتا ہے۔ لیکن میدے کا ہوتا ہے۔ اس لیے ثقیل ہوتا ہے۔ یہ تورتے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ چاہے آپ چپاتی کی طرح کھائیں، چاہے ان کے سموسے بنوا لیں چاہے سینڈوچ۔ اس میں مرکب بھی ہزار قسم کے بھرے جاتے ہیں کوئی میٹھا کوئی نمکین۔ کوئی کھٹا۔ عموماً گوشت یا سبزی بھری جاتی ہے وقت پڑنے پر اس تورتے کی پلیٹ بھی بن جاتی ہے اور نیپکن نہ ہو تو اس کا کام بھی دے جاتا ہے یہ ان کا بنیادی کھانا ہے۔ اس کے بعد اپنا اپنا مقدر بعض کو یہ بھی میسر نہیں تو چنے چبا لیتے ہیں اور جوں جوں ریستوران مہنگا ہوتا جائے دام اور اقسام بڑھتی جاتی ہیں "چیلا کیل" اور "این چلادا" مجھے تو کھانے میں یوں محسوس ہوئے کہ گاڑھے قورمے میں سموسے چبا رہے

ہیں۔ یہ خالص میکسیکی چیزیں ہیں۔ لیکن مجھے تو بالکل نہیں بھائیں۔ ایک دو جگہ لوگوں کو گلابی چٹنی کے ساتھ کینچوے کھاتے دیکھا۔

پچھلے جنم میں میکسیکی قطعی جل مانس ہوں گے کیونکہ ان کو سمندری جانور بہت پسند ہیں۔ ہر کچھوے اور کیکڑے پر ان کی رال ٹپکتی ہے۔ ان کی چاول کی شراب ٹپک جبنیوں کی "موت آتی" سے ٹکر لیتی ہے۔ دونوں ظالم ہیں۔ باروبیوں کی طرح یہ قوم بھی ہری پیلی لیموینڈ خوب ڈگ ڈگا کر چڑھاتی ہے۔

ایک چیز جو محسوس کی وہ یہ کہ ان لوگوں کے کانوں کے پردے بہت مضبوط ہیں۔ کوئی شور برا نہیں لگتا۔ کھانا بھی کھائیں گے تو آرکسٹرا ٹیپ کے سروں میں بجے گا کہ گفتگو تو کیا حلق کے بھی پردے بند ہو جائیں۔ مجھ سے زیادہ شور میں کھانا بھی نہیں کھایا جاتا پھر کھانے کے ساتھ ہی ساتھ جوا بھی چل رہا ہے۔ لوگ بازیاں لگا رہے ہیں۔ کہیں لڑائی ہو رہی ہے۔ کہیں فلک شگاف قہقہے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ لیکن یہ مخصوص میکسیکی ریستوران ہیں۔ بڑے ہوٹل تو سارے جہان کے ایک ہی جیسے ہیں۔ "ہلٹن" "انٹرکونٹی نینٹل" سب جڑواں معلوم ہوتے ہیں۔ چاہے فلورنس ہو یا برازیلیا یا پنڈی۔ اندر بدستور یکساں فضا۔ جب تک ہوٹل سے باہر قدم نہ رکھو۔ یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کس ملک میں بیٹھے ہیں۔

ایک شام ان کے ایک "گیتا نیریا" GUITANARIA میں گئے۔ ایک ننھا تاریک غار جہاں شمعیں جل رہی تھیں۔ جھنڈیاں، بیلون لٹکے ہوئے۔ شراب کی بوتلیں خالی اوندھی۔ سگریٹ کے دھوئیں سے سارا ماحول دھندلایا ہوا آدھی شکلیں مدھم مدھم گیتار پر لونا سرا۔ ہسپانوی دھن میں ہجر و محبت کی تشریح کر رہا تھا۔ رقاصہ اپنا تن اکڑائے سانس روکے مورنی کی طرح لباس کے پر پھیلائے فرش پر ہیلیوں سے ٹھاپ دے رہی ہے اور مٹھیوں سے "کسٹا نٹ" کے تال بھی۔ یہاں سے دل نہ چاہے اٹھنے کو عجب سماں تھا اتنے میں ایک میکسیکی منچلا میرے پاس آن کر شراب آلود سانس میں کچھ بولا۔ جس کا آدھا مفہوم

سمجھ میں آیا اور میں نے بچیوں کے بازو پکڑے اور دم دبا کر بھاگی۔

میکسیکو میں ایک چیز قابل دید ہے۔ وہ ہے "بیلے فوک لوریکو" BALLET FOLK LORICO چونکہ سامراجی ایام میں لوک گیت آہستہ آہستہ طاق نسیاں کی نذر ہو رہے تھے اس لیے پچھلے ۳۵ برسوں میں لوک معاشرے کو بڑی سرعت سے دوبارہ زندہ کیا گیا ہے۔ یہ بیلے اسی کوشش کی نمایاں پیشکش ہے۔ اس میں دو سو رقاص اور مغنیوں نے دیہاتی انڈین طریق حیات پر کلاسیکی انگ میں "اوپیرا" مرتب کیا ہے۔ اس میں آپ تال سُر میں اچھی خاصی تعلیم حاصل کر لیتے ہیں۔ دیسی رسومات، مذہبی توہمات، اور سماجی تکلفات سب رقص کی صورت میں بتائے گئے ہیں۔ صرف ایک نصیحت ہے کہ میری طرح سستے ٹکٹ لینے کی حماقت نہ کریں۔ اتنی اونچی سیٹ ملے گی نیچے سٹیج پر نظر پہنچتے پہنچتے خاصہ وقت لے لے گی دو بھی اگر جھکا نہ گئی۔ میں عموماً ٹکٹ کے معاملے میں کنجوسی نہیں کرتی۔ مگر یہاں چونکہ پورا خاندان ساتھ تھا اس لیے کفایت شعاری کا شوق چرایا۔

جہاں یہ مشہور بیلے منعقد ہوتا ہے وہ بھی قابل تحسین عمارت ہے۔ اسے فنون "لطیفہ محل" PALACE OF FINE ARTS کہتے ہیں۔ یہ میکسیکو کے شاندار اداروں میں سے ایک ہے۔ سنگ مرمر کا یہ محل ثقافتی نشستوں کے لیے بنایا گیا ہے لیکن اس کی زیر سطح زمین اسپنج کی طرح نرم ہے۔

یہاں کے وردی والے گائیڈ نے ہنس کر ڈرایا کہ یہ گذشتہ برسوں میں آہستہ آہستہ بارہ فٹ نیچے دھنس چکا ہے کئی جگہ جہاں سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں اب وہ نیچے جا رہی ہیں۔ گائیڈ بولا "ڈریئے مت اب یہ مزید نہیں دھنسے گا۔" ہم نے سوچا کہ اپنی چار چھٹانک جان ہے، کیا فرق پڑے گا۔

ایک چیز سے میکسیکو میں کہیں مفر نہیں اور وہ ہے "میورل" اس قصر فنون میں بھی دیوار تا دیوار پُر شکوہ میورل بنے ہوئے ہیں۔ اس کے سٹیج کا پردہ شیشے کا ہے جو آہستہ نیچے گرتا

ہے جس کی مصوری پہ پوشیدہ بجلیاں مرتکز ہیں۔ صرف یہ پردہ دیکھنے کے لیے ہی مخلوق ٹوٹی پڑتی ہے۔

میکسیکو کا سب سے بڑا لطف اس کے بازار ہیں لیکن دور "اندرونِ شہر" کے بازار بالکل ہماری طرح بے ترتیب اور غیر محفوظ، غلیظ لیکن ہمارے بازاروں سے پھر بھی بہتر۔ انسان جانور سب ایک ہی سڑک پہ چل رہے ہیں۔ کوئی گدھا گاڑی سے منڈی سے سبزی لا رہا ہے۔ کوئی خچر پر کمہار کا پورا کھیپ۔ وہی ریڑھیوں پر۔ برتن، کھلونے۔ وہی جھک جھک اور چکانا۔ چکانے میں میکسیکی بھی بڑے ڈھیٹ ہوتے ہیں۔ شروع کہاں سے کرتے ہیں اور ختم کہاں پہ۔ ہماری طرح ان بازاروں کی وہی خوشبوئیں۔ وہ آوازے، آپ قدم پھونک پھونک کر رکھیے۔ ایک طرف میلے بنیانوں میں نم نم شیر خوار منہ بسور رہے ہیں۔ ایک طرف مرچوں کے ڈھیر کسی جگہ پر پر نیلا تانبہ، کہیں جڑی بوٹیاں، کہیں لکھا ہے "سینی توریو SANITORIO" ہم سمجھے کوئی مقامی سینی ٹوریم ہو گا۔ معلوم ہوا کہ حمام کو سینی توریو کہتے ہیں۔ ہمارے میاں چار آنے دے کر اندر گئے تو بجائے تولیے کے ڈھائی گز کاغذ ملا۔ فوراً واپس آ گئے۔ آگے بڑھے تو سڑک کے نکڑ پر ایک کالے شال REBOZO میں ایک معمر چیچک کے داغوں والی بڑھیا کھڑی مجرب نسخے اور جڑی بوٹیاں بیچ رہی تھی۔ اس قسم کے نیم حکیموں کو میکسیکو میں کیورین داروز CURAN DEROS کہتے ہیں۔

خیر یہ تو پرانی وضع کے بازار تھے لیکن جدید میکسیکو نے بھی سوپر مارکیٹ بنائے ہیں۔ یہاں خرید و فروخت کی دنیا پستہ بادام سے لے کر واشنگ مشین تک سیلوفین میں ملبوس ہے۔

میکسیکو کی دستکاریاں اس کے لیے زرمبادلہ کمانے کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ اس کی دو وجوہ ہیں ایک تو حکومت نے کئی کارخانے اور دکانیں خود سنبھال لی ہیں۔ جہاں سیاح بے خوف و خطر چیزیں خریدتے ہیں۔ وہاں نہ سونے چاندی میں کھوٹ، نہ کسی چیز کی ساخت کمزور دوسرے یہ کہ میکسیکو کے اندرونی علاقوں میں رواجی دستکاریوں کا ایک چشمہ ابل رہا ہے اور امڈا امڈ کر

بڑے شہروں کے بازاروں میں بہہ رہا ہے۔ حکومت اپنے ثقافتی ورثے پر ناگ کی طرح نظر رکھتی ہے۔ صدیوں سے رنگ اور نقش اور کاریگری کے جو راز سینہ بہ سینہ چلے آ رہے ہیں انہیں برقرار رکھتے ہوئے ان کا سمبندھ جدید تقاضوں سے جوڑ رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ سیاح ٹوٹا پڑتا ہے میں تو دنگ کیا پاگل ہو گئی۔ عقل کچھ کام نہ کرتی تھی کہ کیا خریدوں اور کیا نہ لے جاؤں۔ کاش پاکستان قریب ہوتا تو میکسیکو کے دستی ورثے ٹرک بھر کر خریدتی اور پاکستان روانہ کرتی ہوائی سفر میں کیا خریدا جا سکتا ہے؟ آبی جہاز سے چیزیں بھیج کر کم از کم میرے تجربے خوشگوار نہیں رہے۔ چیزیں ٹوٹیں تو کوئی انشورنس کمپنی دام نہیں بھرتی اگر روپے دے بھی دے تو چیزیں واپس نہیں ملتیں۔

ویسے تو اس موضوع پہ پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے اور مجھے تو اس موضوع سے یوں بھی عشق ہے۔ برسوں سے اس پر ریسرچ کر رہی ہوں۔ قصہ کوتاہ اس کی مایہ ناز دستکاریوں میں سے چند ایک کا ذکر لازم ہے

میکسیکو کو دُنیا کا "دودکش سیم" SILVER FUNNEL کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کی کانیں سب سے زیادہ چاندی اگلتی ہیں اور مخصوص دکانوں پر ہی چاندی کے سامان پر حکومت کی چھاپ ہوتی ہے۔ گارنٹی تو ایک طرف اس میں سیم کاروں کے گُر اور شاہکار دیکھئے ہمارے کشمیری کام کی طرح نازک اور نفیس منبت کاری!! لاڈ کا کام۔ مینا کی گلکاریاں، نیم بہا پتھروں سے مرصع گلدان۔ لیمپ جدید "ڈینش" DANISH ڈیزائن کے ڈنر سیٹ پرانے انگلش "شیف فیلڈ" وضع کی موٹے پیٹ کی کیتلیاں۔ نہایت حسین کالے سینگوں یا چوبی دستے والی کٹلری اگر میرے پاس فالتو ڈالر ہوتے تو تانبے کے دہکتے ہوئے "ازٹین ماسک" خریدتی جو قبائلی سرداروں کی نہایت وجیہہ شکلیں تھیں۔

ایک چیز جو میکسیکو نے ایجاد کی ہے اور جو بالکل ان کی اختراع ہے، وہ ہے "پیوندی دھاتیں" MARRIED METALS پیتل اور چاندی کا "اوکسی ڈائزڈ" دھات کے ساتھ یہ امتزاج

سیاحوں کے لیے ایک نئی ترغیب بن گیا ہے۔ ہر نمائشی اور افادی شے ان پیوندی دھاتوں میں رَے یجئے۔ سیپ کی جڑائی بقیہ ممالک میں ایک معدوم ماضی ہے۔ میکسیکو نے اس فن کو بھی از سرِ نو پروان چڑھایا۔ ہزاروں لوازمات صدف صد رنگ سے مُرصّع !!

میرا تو ایک "اُلّو" پر دل آگیا۔ ڈیڑھ فٹ لمبا، بال و پر سیپ کے۔ آنکھیں بھی ہری چمکتی ہوئی لیکن اس کی قیمت ایک سو ڈالر سن کر عشق رفو چکر ہوگیا۔ ویسے یہ جانور جو ہمارے ہاں گالی ہے لاطینی امریکہ میں لوک دیوتا ہے۔ ہر ذریعہ اور MEDIUM نے اس کی نقل کی ہے۔ مٹّی میں تو اس قدر شاندار و جیہہ اُلّو ملتے ہیں کہ کس کو گلے لگاؤ اور کس کو پھُول چڑھاؤ۔ دو جانوروں کو دیکھ کر میری متاابل پڑتی ہے۔ وہ ہیں گدھا اور اُلّو۔ اتفّاق سے دونوں ہمارے ہاں دشنام ہیں۔ واللّٰہ اعلم کیوں؟

اس ملک نے چمڑے کی صنعت کو بھی بے مثال ترقی دی ہے۔ روز مرّۃ کی ہر ضرورت طرح طرح کے چمڑوں نے پوری کی ہے۔ کوئی سانپ کی کینچلی، کوئی گرگٹ کی، کوئی مگرمچھ کی کھال، کوئی چیتے کی، کوئی لومڑی، کوئی زیبرا کوئی ہرن غرضیکہ انسان کی نمائش اور مانگ کے لیے پورا چڑیا خانہ آباد ہے۔ ظروف گِل CERAMICS پر تو ایک الگ عنوان درکار ہے۔ شمال سے جنوب تک میکسیکو کا ہر شہر اپنی خصوصی روایات۔ خصوصی رازِ تشکیل۔ خصوصی رنگ و زیبائش کے لیے معروف ہے "میتی پیک" METEPEC کے گلی حیوان خریدیئے ___ اوکسا کا OAXACA کی مشہور سیاہ پوٹری یجئے۔ "پیوبلا" PUEBLA کے مضحکہ خیز گلی دیوتا کیتلیوں کی شکل میں خریدیئے۔ جن کی توند بنئے کی طرح، ٹونٹی مسخرے کی ناک کی طرح دس انچ باہر لٹکی ہوئی۔

وہاں کی کشیدہ کاری جتنی باریک ہے اتنی ہی سستی بھی ہے۔ "وی پل" HUIPIL گلے میں ڈالنے کا ایک گول کڑھا ہوا شال میں نے پانچ روپے کا خریدا۔ وہاں کی دریاں بھی جنہیں "سراپ" SERAPES کہتے ہیں ہماری طرح بنی جاتی ہیں۔ تقریباً وہی رنگ وہی نمونے۔ وہی سوا سُکھ۔ وہی

لوازمتیں جو ہمارے ہر قریہ، ہر گاؤں ہر ساحلی کے ہاں لگی ہوئی ہیں غرضیکہ میکسیکو نے چین، جاپان ہندوستان اور اسکنڈے نیویا" کے ساتھ ساتھ ثابت کر دیا کہ دستی ہنر محض ماضی کا ایک رومانی جذبہ نہیں بلکہ کسی بھی جدید ملک کی رگِ اقتصادیات بن سکتے ہیں۔ دستکاریاں اور میکانکی عہد کوئی متضاد دشمن نہیں بلکہ دونوں ہی باہمی بقا کے اصول پر ترقی پا سکتے ہیں۔

میکسیکو لاکھوں سیاحوں اور بے شمار پرستاروں کے باوجود نہیں بگڑا۔ ماسوائے دو چار بڑے شہروں کے بلند اور مہنگے ہوٹلوں کے عموماً زندگی اور اس کی ضروریات مقابلتاً امریکہ اور یورپ سے بہت سستی ہیں: رہایش معقول۔ ٹیکسی جاپان کی طرح سستی اور بہت تیز۔ بخشش بھی کم۔ ایک یا دو روپے سے سب خوش۔ کھانا آٹھ آنے سے لے کر اسی روپے تک، جو آپ کا بٹوہ اجازت دے۔ تفریحات خاصی سستی۔ خرید و فروخت سوائے سیم و سیپ کے بہت ہلکے داموں کی۔ ایک سیاح کو اور کیا چاہیئے!!

کچھ تھوڑے سے تجربے کے بعد میرا تو یہ کہنا ہے کہ مہنگے سے مہنگے شہر میں بھی سستے سے سستا ٹھکانا مل سکتا ہے بشرطیکہ آپ نخرے پیٹے نہ ہوں۔ فرانس ہے تو حسین لیکن بدنام (مہنگائی کے تناسب سے" بدنام" زیادہ موزوں ہے) نیس NICE میں بھی ہمیں ۲۵ روپے یومیہ پر دو پلنگ کا کمرہ اور صبح کا ناشتہ مل گیا تھا۔ بھئی پلنگ کی چادر صاف ہو اور ستھرا غسلخانہ ہو تو بہت ہے۔ اگر ناشتے پر صرف سیاہ کافی اور سوکھے رسک ملیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ باہر جا کر دوبارہ ناشتہ کر لیجئے لیکن صرف رات گذارنے کے لیے تکلفات کی کیا ضرورت ہے۔

ایک سیاح سارے دن کا تھکا ہارا بارہ ایک بجے رات کو بے غل و غش سو جاتا ہے اور صبح چائے پی کر پھر روانہ۔ اسے کہاں فرصت کہ کمرے میں اعلیٰ قالین کی موٹائی ناپتا پھرے یا TV دیکھے یا ان حسین تولیوں کی قطار سے باری باری منہ پونچھے۔ ان چھوٹی چھوٹی آسائشوں سے آپ کی حجامت بنتی ہے اور روپے حرام میں جاتے ہیں۔ میں تو اپنے میاں سے ہر دفعہ اس بات پر لڑتی۔ کبھی ہاری کبھی جیتی

میکسیکو میں بھی شروع کے تین دن تو ایک اے کلاس ہوٹل میں گذارے۔ پھر میں نے چپکے چپکے تفتیش کی۔ معلوم ہوا کہ اس فیشن زدہ علاقے سے چار میل دور ایک اصل نسل کا میکسیلی "پین سیون" PENSIONE تھا۔ اس لفظ سے قارئین یہ نہ خیال کریں کہ پنشن یافتہ لوگ وہاں رہتے ہیں۔ یہ اطالوی لفظ ہے جس کے معنی ہیں چھوٹا سا ذاتی گھر جسے ہوٹل بنا دیا گیا ہو۔

اس میں ایک آزادی، بے تکلفی اور انسانیت کی تسخیر ہوتی ہے۔ ان سرد فلک شگاف شیشں محلوں کی طرح نہیں جہاں انسان اگر دس روپے بیرے کو انعام نہ دے تو وہ ناک چڑھا کر پیٹھ موڑ لے۔

خیر میں تمام خاندان کو کچھ پیار اور کچھ منت سماجت کر کے وہاں لے گئی۔ بچے کہتے ساری کنجوسی یہیں رہ گئی ہے۔ میں نے داؤ کھیلا کہ بڑے ہوٹل تو بالکل امریکی یا یورپی ہیں۔ اصلی میکسیکو دیکھنا ہے تو اس کے باشندوں کے ساتھ رہو۔ غرضیکہ ہم سوٹ کیس "بھر" باندھ کر (اس لفظ بھر میں خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کم و بیش ڈیڑھ سو باریاں شامل ہیں) نفرت ہو جاتی ہے صندوق کھولتے بند کرتے "کیسا گونزالیز CASSA GONZALES" پہنچ گئے ہمارا بہت پرجوش اور مخلصانہ خیر مقدم ہوا۔ وہاں کا مالک "سینیور جورجے" "SIEGNEUR JORJE" ایک نیم گنجا کنوارا تھا۔ جو اپنی معمر اماں اور تین خوبرو ہسپانوی خادماؤں کے ساتھ "یہ" پین سیون چلا رہا تھا۔ جس کے دو حصوں میں چھ سات سیاح خاندان مقیم تھے جو ہر صبح ناشتے پر یکجا ہوتے تھے اور اپنے اپنے کارنامے تجربے سنا کر دن کا پروگرام بناتے تھے۔ ان "سی نیور" کی بہت خواہش تھی کہ ہم رات کو بھی اس بین الاقوامی کارنیول میں شامل ہو کر کھانا کھائیں۔ لیکن ہمارے کھانے زیادہ تر باہر ہوتے تھے۔ اس لیے وہ ہم سے کچھ رنجیدہ سے ہو گئے ویسے بہت شائستہ آداب و نرم لہجے کے انسان تھے۔ ان کی رگوں میں "شی ولری" کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ہر روز ایک نئی سہیلی کے ساتھ رات کو چہل قدمی کے لیے نکلتے تھے۔ ان کی ہسپانوی گوری

گوری خادمائیں، سیاہ لباس اور سپید کردشیے کی ٹوپیاں پہنے بہت پیاری معلوم ہوتی تھیں۔ ہمارے میاں کی تو ساری شکایات رفع ہوگئیں۔ انہیں دیکھ کر وہ پرانے آہنی پلنگوں کی چرچراہٹ، غسلخانے کی قدامت سب بھول گئے۔ یہ کنیزیں کمروں کو آئینے کی طرح صاف رکھتی تھیں اور صبح ناشتے پر ان کے شاداب چہرے دیکھ کر بھوک کھلتی تھی۔ مجھے حسرت اور ارمان ہے کہ کبھی میں بھی ایسی کامنی اور خوبرو لڑکیاں اپنے گھر میں رکھوں۔

لندن اور پیرس کی پارکوں میں آوارہ گردی کے بعد اگر کہیں مزا آیا تو میکسیکو میں ویسے تو گننے پر آؤ تو اسی شہر میں متعدد باغ ہیں۔ لیکن ان میں "چپل توپیک پارک" CHAPUL TOPEC PARK عوام کو بہت محبوب ہے کیونکہ یہ اسی نام کے قلعے اور محل کے اردگرد ہے جو فرانسیسی عہد کی یادوں میں چھنے ہوئے ہیں۔

اٹھارہویں صدی کے فرنیچر، بلّور، جواہر!! سامراجی عہد کی عیاش یادوں کے یہ مقبرے اب آزادی کے بعد عجائب گھر بنا دیئے گئے ہیں۔ ہر کمرے میں دیواروں پر حکمرانوں کے قدِ آدم مرقعے!! کہیں خوفناک مونچھیں۔ کہیں مصنوعی "وگس" WIGS کہیں شاہانہ توندیں۔ بعض کی شکل پر بدہضمی کے نمایاں آثار۔ گویا انہیں میکسیکی غذا راس نہیں آئی۔

تاریخ اور سیاح دوسرے کمروں میں قدم رکھتے ہیں تو اچانک انقلابی آرٹ سے دوچار ہوتے ہیں۔ ایک لحیم شحیم میورل "وادریز" JUAREZ کی سرخ فتح کا اور ایک ادھورا میورل مشہور "سی کوائے روس کا ہے۔

یہ عجیب مصوّر ایک طرف تو انقلابی میکسیکو کی سیاسی آن ہے اور دوسری طرف موجودہ معتدل میکسیکو کے حلق میں ایک ہڈی ہے جو پھنس کر رہ گئی ہے۔ ایک عہد نے اس کمیونسٹ جن کو جلوت خانے دیئے کہ اپنے ہنر سے آراستہ کرے۔ دوسرے عہد نے اسے زندان میں دھکیل دیا۔ آج بھی وہ بدبخت تاریکی میں سانس لے رہا ہے۔

خیر! اس محل کی تمکنت اور تاریخ کو چھوڑیئے اور باہر اس کے پارکوں میں تازی ہوا

کھائیے۔ کیونکہ حسب معمول برق و بادل کا ڈھائی گھنٹہ کا ڈراما روز چار بجے سے شروع ہو جاتا ہے لیکن ذرا دھیمے دھیمے۔ اس لیے آپ برساتی پہن کر اس کی گلابی پھوار میں بھی گھوم پھر سکتے ہیں۔ گلابی اس لیے کہ بادلوں کے اندر ہی اندر شفق بھی پھولتی ہے اور جس نے میکسکو کی آتش فشاں وادی کی شفق نہیں دیکھی اس نے کبھی فطرت کا لال بھبو کا چہرہ ہی نہیں دیکھا۔ اس پارک کے دیرینہ درختوں کے سبز سایوں میں یہ شفق پتوں میں سے جھلملاتی آتشیں بوندوں کی طرح ٹپک ٹپک کر ہمارے جسم اور کپڑے بھگو دیتی تھی۔ میں نے کتنی شامیں یہاں گزاریں اور اب بھی اکثر شاموں کو بیٹھے بیٹھے میرے دل میں اک ہوک سی اٹھتی ہے اور وہ پارک یاد آتا ہے۔

پانی پر رواں ایک باغ "سوچی ملکو" XOCHI MILCO ہے جو سیاحوں کا مکہ بن گیا ہے یہاں ازٹک عہد میں ننھی ننھی کشتیوں کے فرش پر مٹی کی کھاد بچھا کر سبزی اور پھول اگائے جاتے تھے جن کی جڑیں پانی میں تیرتی تھیں۔ یہ "سوچی ملکو" آج بھی گلستان رواں کہلاتا ہے اتوار کے دن پھولوں سے لدے شکارے سیاحوں کو دور دور ساکت پانیوں پر سیر کراتے ہیں۔ ان ہی کشتیوں پر ریستوران چل رہے ہیں۔ چند کشتیوں میں بساطی اپنا مال بیچ رہے ہیں۔ کچھ شکاروں میں ہسپانوی آرکسٹرا اپنی دھنیں بجا رہا ہے۔ قریب جا کر آپ بھی دو روپیہ دے کر اپنا پسندیدہ نغمہ سنیں۔ کسی کشتی میں حسن و جوانی دوش بدوش ہیں۔ معاشرے اور کیتھولک مذہب کا اثر کہئے یا "انڈین" حجاب!! یہاں جوانی کو عریاں اور عشق کو بے حیا نہیں پایا۔ جو منظر یورپ اور امریکہ کی سڑکوں اور باغوں میں دکھائی دیتے ہیں یہاں نہیں کمسن لڑکیاں "فلے منکو" رقاصہ کا لباس پہنے، کان میں بالے ڈالے اور بالوں میں بھڑکیلی کنگھی لگائے اپنے سرخی غازے کے مکمل احساس کے ساتھ مورتیوں کی طرح ٹھمک رہی ہیں۔ کہیں مائیں ایک بغل میں بچہ، دوسری میں پکنک لنچ اٹھائے چلی جا رہی ہیں۔ کچھ مرد ہرے گلابی شربت پی کر ٹھٹھے مار رہے ہیں ایک طرف بساطی اپنے بازار لگائے بیٹھے ہیں۔ غرضیکہ سیاحوں کو پھانسنے کے اس شہر میں ہزار دام ہیں۔

جب کسی ملک کے عجائب گھر کا ذکر آتا ہے تو مجھے ٹھنڈے پسینے آجاتے ہیں داگر مولینا

صلاح الدین کی روح بے چین نہ ہو تو، میں پھر کہوں گی کہ ہماری زبان میں ابھی اتنی وسعت اور لچک پیدا نہیں ہوئی کہ فنی اصطلاحات سے عہدہ برا ہو سکے۔

خیر صاحب! دنیا میں جہاں بھی گئے عجائب گھر نہیں چھوڑے۔ بعض وقت تو میرے بچے بیزار ہو جاتے تھے کہ مجھے ان فنی قبرستانوں میں کیا مزا ملتا ہے۔ ماضی وفات پا گیا۔ اس کی موروثی یادگاروں کو کیا کرنا؟ میکسیکو میں بھی کئی عجائب گھر دیکھے۔ ہر ایک کا ذکر تفصیل سے کروں تو وقت میرا ضائع ہوگا اور مزا شاید ان چند کو آئے جو اس سے شغف رکھتے ہیں۔

"موورنو میوزیم" MUSEO DE ARTE MODERNO کیا شیریں زبان ہے!! ایک گول سیاہ شیشے کا "الرٹا موڈرن" عجائب گھر ہے جہاں میکسیکو کے چار لافانی مصوّروں کی مستقل گیلری ہے۔ کئی کمروں میں تجریدی آرٹ کے اوندھے سیدھے فریم ٹنگے ہوئے ہیں اس عجائب گھر کی سب سے زیادہ قابل دید چیز گول چھت ہے جو شفاف سنگ جراحت کی بنی ہوئی ہے۔ اس وقت شام ہو چلی تھی۔ ڈوبتے سورج میں یہ چھت ایک روشن فلک معلوم ہوتی تھی۔ دوسرا قابل ذکر عجائب گھر "فریڈ کاہلو" FRIDA KAHLO کی ذاتی رہائش گاہ تھی۔ یہ مصوّرہ اپنی ذات سے بھی معروف تھی اور اس وجہ سے بھی کہ وہ "ڈیگو ریویرا" کی نیم انڈین سیاہ بالوں والی بیوی تھی۔ اس گھر میں ان دونوں شکاروں نے سالہا سال حُب الوطنی کی آگ سے یہ کینوس روشن کیے۔

"فریڈا کاہلو" کو امریکیوں سے نفرت تھی۔ وہ اپنی مصوّری کے ذریعے قوم کو عزت نفس کا پیغام دیتی تھی۔ اس کی تصاویر میں اکثر موت، تاریکی، سنگدلی، کرب و درد نظر آتا ہے لوگ اسے مایوس کن آرٹ کہتے ہیں۔ لیکن مجھے اس عورت سے جاتے ہی ہمدردی ہو گئی۔ عمر کا بشیتر حصّہ اسنے اپاہجی WHEEL CHAIR میں گذارا اور قوم کی پسماندگی اور تلخیوں کو رنگوں میں بیان کیا۔ آرٹ میں خلوص اور حقیقت ہونی چاہیے۔ چاہے وہ دلربا ہو یا روح فرسا۔

اس گھر میں قومی ہیرو "ریویرا" کی کہیں ٹوپی ٹنگی ہوئی تھی کہیں چھڑی. موت انسان کو متبرک بنا دیتی ہے. قوم ایک فنکار کو سولی پر لٹکا دیتی ہے اور پھر اسے فوراً شہید کا لقب دے کر اس کے جوتے بھی تاریخی طاقوں پر رکھ دیتی ہے.

ایک عجائب گھر نہ دیکھنے کا مجھے قلق رہ گیا اور وہ تھا "ڈیگو ریویرا" کا ذاتی جمع کردہ ذخیرہ جسے وہ آخری سانس تک بنا رہا تھا. یہ اس جنونی دیو کا اپنی قوم کے لیے آخری تحفہ تھا. سُنا ہے اس میں اس کے خود یافتہ و خود ساختہ تقریباً ساٹھ ہزار مرقعے اور عجوبے ہیں جن میں زیادہ تر قدیم انڈین معاشرے کے شہ پارے ہیں۔

لیکن جس میوزیم کا اب ذکر آنے والا ہے اس کا جواب نہیں. اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ دنیا کا سب سے وجیہہ اور تشکیل عجائب گھر کونسا ہے تو میں بلا تامل جواب دوں کہ "میکسیکو کا میوزیم آف این تھرو پالوجی" MUSEUM OF ANTHROPOLOGY یہ پہلے صرف میری حقیر رائے تھی لیکن جب پچھلے دنوں "یونیسکو" UNESCO کے بین الاقوامی عجائب خانوں کے صدر ملے تو انھوں نے میرے منہ سے لفظ چھین لیے اور مجھے سُن کر خوشی اور اطمینان ہوا کہ اتنی بڑی ہستی بھی میری ہم رائے ہیں۔

یہ عجائب گھر حکومت نے قومی احساس و فخر کا کعبہ بنایا ہے. اس پر بہترین صنّاع اور ماہرین نے برسوں کی کاوش کے بعد سنگ مرمر اور سنگ سرخ میں ایک خواب پیش کیا ہے یہ صبح سے رات نو بجے تک کھلا رہتا ہے. بہت وسیع اور شاداب باغ پار کر کے پہلے تو آپ اس کے داخلے پر ٹھٹھکئے. وہاں پتھر کا دیو پہرہ دے رہا ہے. یہ ہے اس کا قدیم دیوتا "تلالوک"

جب میں یہاں پہلی دفعہ گئی تو وقت غروب آفتاب کا تھا اور یہاں سرخ مٹی کی بیرونی فصیل آتشیں شعاعوں میں تمتما رہی تھی. فوارے اور مرمریں دالان پار کر کے اندر گئی تو بہت بڑے استقبالیہ ہال میں ہر زبان میں حسین گائڈ لڑکیاں, سٹالوں پر ہر زبان میں اعلیٰ کتابیں، نقشے کچھ مشہور پروفیسروں کے مختلف کمروں میں لیکچر ہو رہے تھے. اگر آپ یہ بھی نہ سننا چاہیں تو عجائب گھر

کے ہر کمرے میں بٹن دبا کر ٹیپ ریکارڈ پر اس عہد کی کہانی سن لیجئے. جس سے وہ کمرہ آراستہ ہے. لیکن ابھی دل نہیں چاہتا کہ فوراً تاریخ میں چھلانگ لگائی جائے. ابھی صرف اندرونی اور بیرونی ساخت سے مرعوب ہوں. مؤرخ داد روہ موسیخ جس سے آپ اور ہم چار پائیاں بنتے ہیں، کا میورل بنا ہوا ہے. میکسیکو میں کسی میورل کی پیمائش بیکار ہے. ہر میورل قیامت کے فتنے کی طرح دراز ہے. ایک طرف بلور صد رنگ اور آہنی آبنوس کا میل. یہ بھی نئے قسم کا دیوزاد میورل تھا. میں تو سمجھتی ہوں کہ سارے میکسیکو کو" میورل معاشرہ کہنا چاہیئے. اندر وسیع دالان میں جائیے تو لمبے لمبے ستون ان پر گلگوں بیلیں چڑھی ہوئی. ستونوں کے سر پر پوشیدہ سوراخوں سے دھیمے دھیمے آبشار رواں جن کی ہلکی پھوار نے میری باندھی ساڑھی کو نم کر دیا. لیکن یہ میرا قصور تھا. اتنے قریب جانے کی چنداں ضرورت نہیں تھی. اُس دلکش دالان میں کھڑے ہوکر اندازہ ہوتا ہے کہ عجائب گھر کی ساخت گھوڑے کی نعل کی طرح (U) یوں ہے. دو منزلوں میں میکسیکو کی کلچرل کا ریزہ بہ ریزہ تجزیہ کیا گیا ہے. ہر بڑا ہال ایک عہد پر مقسوم ہے.

جو اندر آکر دیکھئے تو کئی ہفتے گزر جائیں نہ دل بھرے نہ گنجینہ ختم ہو. صرف مقدار کا سوال نہیں ہے. دنیا کے ملک اٹے پڑے ہیں بیش بہا چیزوں سے. لیکن یہاں جس طرح ان کو ترتیب دے کر سجایا گیا ہے وہ قابل تحسین ہے.

کمرہ نمبر اوّل "انسانیت" کے نام سے معنون ہے. اس میں دنیا کی ہر نسل موجود ہے. دوسرے ہال میں اس ملک کی "ازلی" ابتدا. اور اس طرح ہر ہال میں انسان کا ارتقا پھر "تیوتی ہوا کان" TEOTIHUACAN کا پہلا زریں عہد. پھر "تول تیک" TOLTEC عہد جنہیں ماہرین عمارت کہا جاتا تھا. بعد ازاں "شی شی میک" قبیلے CHICHIMECS کا باب شروع ہوتا ہے. یہ خونخوار وحشی بھی تعمیر کا شوق رکھتے تھے. اس کے بعد بلند بخت شاہان ازتک کے راج کا آغاز ہوتا ہے. ہر کمرے میں علاقائی تاریخ ہے. اوک ساکا OAXACA کے متبرک شہر. ان کے راز حنوط اور ممی. "مزتک" کے اوزار اور زیورات، گلف کوسٹ کے

"اولمک" قبائل جنہوں نے آنے والے "زپوتک" عہد کو زراعت و سنگ تراشی سکھائی۔

ایک جامع ہال "مایا عہد کے لیے وقف ہے جو ازٹیک سے اہمیت میں کم نہیں۔ یہ مایین معاشرہ "یوکاتان" YUCATAN میں دو ہزار سال پھلتا پھولتا رہا اور ہسپانوی فاتحوں کا زبردست مقابلہ کیا۔ یہ مایا قبائل بہت نفیس اور ترقی یافتہ لوگ تھے۔ یہ علم نجوم، علم ہنر، دستی ہنر اور فنون لطیفہ پر بہت حاوی تھے۔ ان کے طلائی برتن و زیورات دیکھ کر سیاح عورتوں کے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔

جب آپ نچلی منزل پر تھک جائیں اور جوتی چھوٹی ہونے لگے تو اس کے ریستوران میں آرام سے بیٹھ کر کھائیے۔ کھانا اگر AUTOMATIC مشین سے نکال لیے تو آٹھ آنے میں پیٹ بھر جائے گا۔ اگر باہر میز پر بیرے کو آرڈر دیجئے تو تین چار روپے میں میکسیکی "تاکو" اور کافی لے لیجئے اس عجائب خانہ پر میں نے کئی حملے کئے تو کچھ حاصل ہوا، ابھی بالائی منزل باقی ہے۔ گھبرائیے نہیں میں تو خود آپ سے زیادہ تھکی ہوئی ہوں۔ مختصر الفاظ میں یہ کہ اس منزل میں موجودہ میکسیکو کے قبائلی و علاقائی "لوگ معاشرے" آباد ہیں جو نیچے کی منزل کا تضاد ہیں۔ ہر کمرے میں ان کے بھانت بھانت کے دیہات آباد ہیں۔ ساحل تا ساحل، کوہ بہ کوہ، قریہ بہ قریہ ہر نوع کے رہن سہن، لباس خوراک وہاں رکھی ہے۔ آج کے زندہ میکسکو کو اس کے ہمہ گیر تنوع میں دیکھنا ہو تو اوپر کی منزل میں گھومیئے۔

اگر مجھے اس شہر میں صرف چوبیس گھنٹے دیئے جاتے تو میں ایک تہائی وقت یہاں گزارتی۔ یہ عجائب گھر، علم کا منبع! فن معماری کی معراج! جمالیات پرست کا مسجود!!!

ہمارے ناظم و مہتمم اس سے اگر چند نکتے ہی سیکھ لیں تو غنیمت ہوگا۔ عجائب خانہ یا درفتہ کا تابوت نہیں ہوتا۔ اگر حاضر کو گذشتہ سے کچھ سیکھنا ہے اور مستقبل کو نئی معنی رکھتا ہے تو عجائب گھر نظری تعلیم VISUAL EDUCATION کا سب سے اہم ذریعہ ہو سکتا ہے

بچے میکسیکو سٹی میں گھوم گھوم کر عاجز آگئے تھے۔ ہم نے شہر سے باہر سیر کی صلاح کی۔

کرائے پر ٹیکسی ٹھہرائی۔ میکسیکی ٹیکسی والا بھی کبھی "نہ" نہیں کرتا۔

"انگریزی بولنی آتی ہے؟" "ہاں"

"راستے معلوم ہیں؟" "ہاں"

"۱۲۵، پیسو کرایہ لوگے؟" "ہاں"

کم بخت ایک بات پر قائم نہیں رہا اور قائم کیسے رہتا۔ ہماری بات ہی نہیں سمجھا اگر ذرا بھی اسے انگریزی آتی تو سفر زیادہ مزے کا گزرتا۔

بہر حال ہم نے سب سے پہلے "ٹاسکو" TAXCO کی ٹھانی۔ یہ پہاڑوں کی کوکھ میں ننھا سا شہر ہے جسے "سیم ستان" کہتے ہیں۔ یہ کبھی نقرئی کانوں کا گہوارہ تھا۔ پھر تاریخ نے اسے بھلا دیا۔ اب پچھلے بیس سال میں اس کی قسمت پھر جاگی ہے۔ حکومت نے اس کی پرانی وضع قطع ذرا نہیں بدلی۔ وہی پرانے ہسپانوی "ولا"۔ تنگ پتھریلی سڑکیں، زنگ خوردہ گرجا۔ کبوتروں کی بیٹوں اور موم بتیوں کی بُو سے اٹا ہوا۔ ننھے ننھے ریستوران بے شمار چاندی کے سامان کی دکانیں، میکسیکو سے سستی لیکن جدید نمونے سے ذرا کم۔ یہاں خوب گلیوں میں ٹہلے۔ ایک ننھی سی قدیم سرائے میں کھانا کھایا۔ پھر اس خوابیدہ آتش فشاں پہاڑ سے اترائی شروع کی۔ اسّی میل واپس۔

واپسی پر سڑکوں پر غریب بچے کچھ چیزیں بیچ رہے تھے۔ کار روکی تو معلوم ہوا کہ زندہ "گرگٹ" بک رہے ہیں۔ میکسیکی اسے بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ آنتیں واپس!! بچّی نے جلدی سے فوٹو کھینچا اور پیسے پھینک کر ہم بھاگے۔

دیہی منظر پر سکون، چاروں طرف ٹیلے اور سبزہ، راستے میں دودھ والے گدھوں پر ڈول لٹکائے جا رہے ہیں۔ امریکہ کے بعد یہ منظر ہمیں دھرتی کے قریب معلوم ہوا۔ شام کو ہم "کورنو" کا CURNEVACA پہنچے۔ یہ میکسیکو سے تین ہزار فٹ نیچے ہے تقریباً TROPICAL موسم ہے۔ کیسے کیسے پتّے، کھجور، پام، "بوگن ولیا" اور ہزار بیل بوٹے۔ اس کی تاریخ سب

سے زیادہ جامہ زیب، اس کے پھولوں سے ڈھکے "ولا" اور سبزہ زار ہیں۔ جہاں بھاری بھرکم جرنیل، وزرا اور کئی سابقہ صدر رہتے ہیں۔ سارا سال یہ مستی، موسم نہ گرمی جائے نہ سردی۔

یہاں سب سے پہلے گائیڈ آپ کو زیارت کے لیے ہسپانوی کامران "کورتے" کا محل دکھائے گا جو آج آئین ساز اسمبلی بن گیا ہے۔ پھر جنگ آزادی میں میکسیکو کا لیڈر "مورے لوس" بھی یہاں عرصہ دراز مقید رہا۔ زپاٹا کے کسانوں کی بغاوت اور انقلابی معرکے بہت جذبے والفت سے درودیوار پر بنے ہوئے ہیں۔

ایشیا کی طرح یہاں پر بھی سامراجی عہد کی نشانیاں مٹائی جا رہی ہیں۔ خود غریب کورتے کا مجسمہ جس کے نام سے یہ محل منسوب ہے یہاں سے ہٹا کر ایک ہوٹل کو بیچ دیا گیا ہے۔

تیسرے پہر ہم "بوردا گارڈن" گئے۔ یہ چاندی کے کروڑپتی سوداگر نے بنایا تھا اور یہاں ملکہ "کارلوتا" بیشتر وقت گزارتی تھی ایک عجیب حسرت اس کے درو دیوار پر برس رہی تھی۔ وہی کیفیت جو نورجہاں کے مقبرے پر جا کر ہوتی ہے۔

حالانکہ سوائے پھولوں کے سب ہی کچھ تھا۔ آٹھ تالاب، فوارے، تاریخ کے خاموش شاہد، دیرینہ درخت۔ سنگتراشیدہ جھروکے، ستون، ڈھلتے سورج کی یرقانی دھوپ امرودوں کے درخت پر پڑ رہی تھی۔ غریب ملکہ کارلوتا!

واپسی پر رات زیادہ ہو گئی اور کار میں پھر میکسیکو کی چڑھائی، اوپر طرہ یہ کہ اپنی زندگی کا بدترین طوفان شروع ہو گیا۔ موسلا دھار بارش۔ باوجود WIPERS کے ناک کے آگے کچھ نہ سوجھے۔ پہاڑوں میں ننھی سی لال ٹیکسی ایک بیربہوٹی کی طرح رینگ رہی تھی بجلی کوند کوند کر ہماری کار کے ونڈ اسکرین پر گرے۔ ساری آیتیں قرآن کی دہرا دیں۔ کیا کڑک، کیا چمک! معلوم ہوتا تھا فطرت اپنا صدیوں کا دبایا ہوا غیظ و غضب آج ہی نکالے گی تکرتکر کر کے ختم ہوا طوفان۔ مطلع صاف ہوا۔ کچھ دور نیچے وادی کے برقی قمقمے چندھیاتے

نظر آئے۔ تاروں کی دودھیا دھنک میں پہاڑوں کے سیاہ دیوتا لمبے لمبے لیٹے تھے۔

FIESTA

اگلے روز ایک قریب کے گاؤں "فی ایستا" جا دھمکے۔ وہاں کی دیرینہ باشندہ ایک مریکن بڑھیا اپنے قدوقامت کی وجہ سے ہماری عمدہ محافظ اور باڈی گارڈ بن گئی۔ شکر ہے لوگ کافی پینے میں مست تھے۔ ہم پر نظر عنایت کی۔ ٹکیلا TAQILA ان کی ظالم ٹھرے کی طرح مشروب ہے وہ مقور CACTUS سے کشیدہ ہوتی ہے۔ وہ پی پی کر خوش باش کسان گھیرا ڈال کر ناچ رہے تھے، باقی تالیاں بجا رہے تھے اور گا رہے تھے۔ کوئی دقیانوسی "ماریاچی" MARIACHI جو ہمارے میراثی کے ہم وزن اور ہم معنی ہیں اپنے باجوں پر گھسی ہوئی دھنیں بجا رہے تھے۔ ویسے میکسکو میں ردی سے ردی "ماراچی" کالے لباس اور چاندی کے بٹن پہنے بہت وجیہہ نظر آتے ہیں۔ کبھی لوگ ناچتے تھک گئے۔ پھر دیر تک خاموشی پھر ایک دم کہیں پٹاخے چھوٹے، پھر بھگدڑ مچی۔ جوش اٹھا، پھر اپنی جان ہلکان کرنی شروع کردی۔

یہ غریبوں کی تفریح ہے۔ اس میں ان صاحبان کو مزہ نہیں آسکتا جو کلاسیکی بیلے اور T V کے عادی ہیں۔ ان تفریحات میں بے ترتیبی بے تکلفی، بدنظمی، مزاح و مستی شامل ہے۔ کہیں کسی کا جھنڈا کھو گیا۔ کسی کی ٹوپی اڑ گئی۔ کسی عورت کا کنگا یا پھول چوم لیا۔ غرضیکہ اچھا لطف رہا امریکن بڑھیا بولی۔ یہ تو منی فی ایستا" MINI FIESTA تھا۔ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ اگر تم سال بھر اس ملک میں رہو تو ہر مہینے کوئی نہ کوئی "فی ایستا" دیکھو۔ یہ مخصوص مذہبی دنوں یا موسمی تہواروں پر منعقد ہوتے ہیں اور ان میں ساری آبادی ٹوٹ پڑتی ہے۔ ان "فی ایتا" میں علاقائی لباسوں، کھیلوں اور آتش بازیوں کا مقابلہ بھی ہوتا ہے۔ ایسٹر کی چھٹی میں یہ بالکل راون کی طرح جوڈا JUDAS کا آتشی پتلا بنا کر فلیتے لگاتے ہیں اور جب وہ پھٹتا ہے تو اس طرح خوش ہوتے ہیں۔ گویا مسیح فروش کا آج ہی انتقام لیا جا رہا ہے اور" یلالوپ گرجا کی کنواری حضرت مریم کا جشن کئی دن چلتا ہے۔ اگر تم نے یلالوپ کی زیارت نہ کی تو اس ملک سے ناواقف رہ جاؤ گی"۔ میں نے کہا۔ "اپنی ننھی سی جان کو کہاں کہاں لے جاؤں اور کیا کیا دیکھوں۔ پہلے ہی ہم

میکسیکو میں پروگرام کے خلاف زیادہ ٹھہر گئے تھے۔ جو ہفتہ ہم نے لاس ویگاس اور سکاکو کے لیے مقرر کیا تھا۔ وہ بھی یہیں گزار دیا۔ بچے مجھ سے بیزار تھے اور میرا بس نہ چلے کہ ان کی تین گٹھڑیاں بنا کر لاس ویگاس روانہ کر دوں۔ آخر میں یہی بیٹے اپنے والد کے ساتھ سازش کر کے میرا "جمیکا" JAMAICA کا سفر ٹورپیڈو کر وا دیا اور اپنے مرغوب امریکی شہر دیکھے۔

میکسیکو کا کوئی ذکر مکمل نہیں ہو سکتا۔ جب تک آپ اس کی بل فائٹ نہ دیکھیں۔ میرا بالکل ارادہ نہیں تھا۔ اس کے متعلق لکھوں، کیوں کہ زیادہ تر قارئین نے یہ تماشا کم سے کم فلموں میں تو ضرور ہی دیکھ رکھا ہے۔ پھر مجھے خود ڈر تھا کہ شاید خونریز وحشی کھیل میری نازک انتڑیاں برداشت نہ کر سکیں۔ اتفاق سے میکسیکو کی ایک کتاب ہاتھ آئی۔ جس کے اولین باب میں ہیمنگو سے HEMINGWAY نے ایک سوال پوچھا تھا۔

"آپ کس کی طرف ہیں؟

"سانڈ کی طرف"؟

"یا انسان کی طرف"؟

اگر آپ سانڈ کے طرف دار ہیں تو ہرگز یہ لڑائی نہ دیکھیں اگر انسان کے خیر خواہ ہیں تو یہ سمجھ لیجئے کہ سانڈ کو مارنا نہایت اہم ہے۔ ورنہ وہ انسان کے پارچے کر سکتا ہے۔ ایک پلا ہوا سانڈ افریقہ کے شیر ببر کو سینگوں پہ اچھال کر پھینک سکتا ہے۔ انسان کیا شے ہے؟ دوسرے یہ کہ اگر اسے آج نہ مارا جائے تو کل پرسوں ویسے بھی وہ کسی قصاب کے ہاتھوں ذبح ہو گا۔ کیونکہ اس کا گوشت شوق سے کھایا جاتا ہے۔"

یہ پڑھ کر ہماری انتڑیوں کو نفسیاتی تکیہ حاصل ہوا۔ ہم نے کمر باندھی۔ بہ ساتی لی دکیونکہ چار بجے کے بعد پھوار لازم ہے۔ بچے پہلے سے کہیں زیادہ اچھلتے رہے۔ یہ "بُل رنگ" ELTOREO بھی لاطینی امریکہ کا سب سے وسیع میدان ہے۔ اور چاروں طرف اوپر تک ایک لاکھ آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔ یہ ہفتے میں تین روز کبھی کبھی بھرا رہتا ہے چاہے کوئی موسم ہو۔

گرمیوں میں اس کے بہترین کھلاڑی اسپین جاتے ہیں اور سردیوں میں دنیا کی اعلیٰ ٹیمیں یہاں آتی ہیں۔ خیر ہم نے پہلے سے ٹکٹ لے رکھے تھے ورنہ بلیک میں تگنے داموں کے ملتے۔ گائیڈ بہت سارے تھے آسانی سے سیٹ مل گئی۔ وہی بینڈ، وہی پریڈ، وہی جج صاحبان کا جلوس، وہی مٹیاڈوروں کا تام جھام معلوم ہوتا تھا بس اب "ریٹا ہیورتھ" کی کسر ہے اتنے میں ایک سیاہ فام بربریت پھن پھناتی ہوئی داخل ہوئی۔ اس کا نام اور وزن بھی تختے پر جلی الفاظ میں آگیا۔ خیر اس ڈرامے کے تینوں ایکٹ سے ہم روشناس ہوئے۔

پہلی دو لڑائیاں تو باوجود دہشت کے دیکھ لیں۔ پھر ذرا ذرا مزہ آنے لگا۔ خون منہ کو لگ گیا۔ اس کے علاوہ HERD INSTINCT کا بھی تقاضا تھا۔ تیسری لڑائی میں ہم نے بھی تالیاں بجا بجا ہتھیلیاں لال کرلیں۔ پھر جمائی آئی۔ چلو گھر۔ بچوں نے کہا "نہیں ہرگز نہیں" پھر بیٹھ گئی۔ اتنے میں ایک شریر سانڈ اکھاڑے میں گھسا تو کسی کے قابو میں نہ آئے اور آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک چھلانگ لگا کر کمبخت مجموں کی گود میں آن گرا۔ جوا فراتفری مچی کہ ہنسی کے مارے برا حال۔ مسلح سپاہیوں اور ماہرین نے اس آبنوسی شرارے کو مشکل سے رام کر کے کھونٹے پر پہنچایا۔

پھر چوتھی بازی شروع ہوئی۔ خاصی پھُس پھُسی۔ مٹیاڈور کوئی ڈرپوک اناڑی تھا۔ نہ شہتیر بھونک سکا۔ نہ سانڈ کو پینترے دکھا سکا۔ لوگوں نے آوازیں کسنی شروع کیں۔ یہ ناظرین بھی ظالم نعل ہوتے ہیں۔ کسی کو نہیں چھوڑتے۔ پھر یہ کہ وہاں کی "چناؤ کمیٹی" بدنام ہے اپنے پٹھو پالتی ہے اور بعض سمدھ ماڈرن کو نہیں بھیجتی۔ اب اس ظالم کھلاڑی پر صلواتیں پڑنی شروع ہوئیں۔ ہمارے یہاں سڑے انڈے ٹماٹر پھینکے جاتے ہیں۔ میکسیکو میں بھدّے بھسنڈی مٹیاڈور پر کشن اور تکیے پھینکے جاتے ہیں۔ پلک جھپکتے ہی اکھاڑے میں درجنوں کشنوں کے ڈھیر ہو گئے۔ اتنے میں نہ جانے کہاں سے ایک نہایت وجیہہ شکل نوجوان لڑکے نے زقند لگائی اور عین اکھاڑے کے بیچ سفید پتلون میں کھڑا ہو گیا اور اپنے ننھی ہاتھوں سے

سانڈ کو للکارا۔ سارے عوام میں شور مچ گیا کہ یہ روپ اور شکتی کا دیوتا کہاں سے اترا۔ سانڈ بھی نظر پہچانتا ہے۔ مسکین پر شیر تھا اور اس جانباز کو دیکھ کر پیچھے ہٹنا شروع ہوا۔ پھر اس جوان نے سانڈ کے عین سامنے نہتہ جا کر گھٹنے ٹیک کر پھر "تورو تورو" کر کے چیلنج کیا۔ اس پر تو حاضرین خوشی و فخر سے پاگل ہو گئے۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دی۔ ہماری "مرحبا" اور روسی "برادو" کی بجائے یہ لوگ "اولے اولے" پکارتے ہیں تالیوں اور اولے اولے سے فضا بھری ہو گئی ہم نے بھی "اولے اولے" چیخ کر گلا بٹھا لیا۔ جو جس کے ہاتھ میں تھا اس پر نثار ہو رہا تھا۔ پھول، ریشمی رومال، خواتین نے اپنی حسین کنگیاں، دستانے، مصنوعی زیور بھی ڈالنے شروع کر دیئے۔

ہمارا جوش میں بُرا حال، ادھر جج صاحبان کا ہم سے بُرا حال۔ کیونکہ اس جوان نے ان کے سچھو کی نالائقی کو طشت از بام کر دیا۔ پولیس بھیجی گئی اس کو پکڑنے کے لیے جب تک پولیس آتی، اس جانباز ہیرو نے شمشیر چھین کر سانڈ کے عین گردن کے پٹھوں میں بھونک کر اسی سرعت سے پھر زقند لگا کر اوپر اپنی نشست میں واپس آگیا لوگوں نے اسے اپنی پیٹھ پر بٹھا کر جلوس نکالنا چاہا تو پولیس پہنچ گئی۔ اس کو گرفتار کر کے پانچ سو پیسو PESO جرمانہ کیا۔ یہ حسین جوان اپنی قوم کو جتانا چاہتا تھا کہ "سلیکشن کمیٹی" کتنی نالائق ہے۔

خیر ایک ڈرامے کے اندر دوسرا ڈرامہ دیکھ کر ہم پرسن ہو گئے۔ ایک ٹکٹ میں کئی مزے۔ یہ بل فائٹ بھی یاد رہے گی۔ باہر نکلے تو چھابڑی والے۔ ریڑھی والے۔ ہماری طرح چاٹیں، بھنے ہوئے بھٹے وغیرہ بیچ رہے تھے۔ ہم نے خوب الا بلا کھائی اور رات بھر پیٹ کے درد میں خوب روئے۔

کسی ملک کی ترقی کا معیار اس کی تعلیم سے کرنا چاہئے۔ میکسیکو کی حکومت نے تعلیم کو ایک ادگی سی اہمیت دی ہے۔ نہ صرف شہروں میں بلکہ دور افتادہ پہاڑوں کی بستیوں میں بھی تعلیم لگاں کا پروگرام شروع کیا۔ استاد گھوڑوں خچروں پر جا کر مدرسے لگاتے ہیں۔ پرائمری تعلیم لازمی

اور مفت ہے۔ سارے ملک میں اکیس یونیورسٹیاں ہیں۔ خود دار السلطنت میں منف الارحن کی قدیم ترین یونیورسٹی ہے جو کئی طوفانی مد و جزر کے بعد حکومت نے ایک لامحدود رقبے میں قائم کی ہے۔ ہر شہر کے اندر ایک شہر آباد ہے۔ اسی یونیورسٹی کو پانچ کروڑ ڈالر 50 MILLION DOLLARS کی رقم سے درجنوں ماہرین عمارت، مصوّروں، سنگتراشوں نے آراستہ کیا ہے۔ اس کے رقبے میں اسّی فلک بوس عمارات ہیں۔ کھیل کود کے لیے تقریباً سوا لاکھ نشستوں کا سٹیڈیم ہے۔ پون میل لمبی فنونِ لطیفہ کی عمارت ہے، بارہ منزلہ کتب خانہ ہے اور دنیا کا سب سے بڑا نہانے کا تالاب ہے۔ اس تالاب کے نیچے ایک شیشے کی کھڑکی ہے۔ جہاں سے میں نے تیراک لڑکے لڑکیوں کے کچھ فوٹو بھی کھینچے۔ مخلوط تعلیم و مخلوط کھیل میں جنسی تفوق کا احساس بہت کم ہو جاتا ہے۔ ہر عمارت پر میکسیکو کے مخصوص میورل درخشاں ہیں۔ آنکھیں ان کو دیکھ دیکھ کر دکھ جاتی ہیں لیکن دل نہیں بھرتا۔ کیونکہ ہر میورل ایک نئی داستان ہے۔ ایک نئی ترتیبِ حُسن ہے۔

حکومت زیادہ تر پیسہ خود خرچتی ہے اس لیے فیس برائے نام ہے (تقریباً ۲۵ روپے سالانہ) داخلی امتحان آسان ہے اس لیے ۷۵ ہزار طلبا الّل ٹپ بھرے ہوئے ہیں۔ کچھ پروفیسر شاکی تھے کہ بہت آسانیاں بہم پہنچانے سے بہت سے طلبا لاڈ میں بگڑ گئے ہیں اور تعلیمی معیار گر گئے ہیں طلبا شور مچا کر ہر دفعہ پرچے آسان کروا لیتے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ آسائشوں کے طلبا پھر بھی اکثر بلوے کرتے ہیں، کبھی بسیں جلا دیں۔ فرنیچر جھیل میں ڈال دیا۔ کبھی ہڑتال کر دی۔ میں نے کئی دفعہ سوال کیا کہ کیوں؟ کوئی وجہ ضرور ہو گی۔ ایک دو نے دبی زبان سے کہا کہ اصل میں طلبا کی ذاتی شکایات کم ہیں، سیاسی زیادہ ہیں۔ انہیں گلا گھٹی جمہوریت پسند نہیں، زیادہ آزادیٔ رائے مانگتے ہیں۔ پھر ان کی اکثریت سرمایہ دارانہ نظام کے سخت خلاف ہے۔ زیادہ تر جوان اپنے اپنے قومی مسائل کا فوری حل سوشلزم کو تصوّر کرتے ہیں۔ اور طلبا کی آخری چڑ بیرونی دخل در معقولات ہے۔ جتنا وہ شمالی امریکنوں سے بیزار ہیں اتنا ہی ان کا اثر سیاست اور اقتصادیات میں پاتے ہیں۔

میکسیکو کے متعلق جو بھی اتنے دنوں میں اور اس سے پیشتر مطالعہ اور تبالہ خیالات سے اندازہ ہوا۔ وہ یہ کہ کئی باتوں میں ہم سے بہت آگے ہیں اور کئی چیزوں میں ہم سے مشابہ۔ ہماری طرح اس کی سب سے نمایاں ترقی خوراک میں ہے۔ اس مشکل جغرافیے والے ملک کو خوراک کی پیداوار میں مکمل خود اعتمادی حاصل ہے۔ یہ کسی بیرونی طاقت کو "ان داتا" نہیں مانتا بلکہ خوراک برآمد کرتا ہے۔ اس کی گیہوں غلے کی کاشت سو فی صد میکانکی طریقوں سے ہوتی ہے سوائے بھاری مشینری کے (جو امریکہ سے آتی ہے۔ ساری ضروریات خود ساخت کرتا ہے۔ حتیٰ کہ کاریں اور زراعتی آلے بھی۔

اقتصادیات میں کیپٹل ازم غالب ہے FREE ENTERPISE کو بالکل کھلی چھٹی ملی ہوئی ہے۔ سوشلزم کو صرف یہاں تک اجازت ہے کہ تیل قومیایا گیا ہے، بجلی ٹیلیفون اور ریلوے بھی حکومت کے پاس ہیں۔ ٹیکس بھی بہت ہلکے ہیں صرف پچیس فیصد ایروں پر۔ امریکیوں کو ۴۹ فیصد سرمایہ لگانے اور ۱۵ فیصد اپنا سٹاف رکھنے کی اجازت ہے نظامِ سرمایہ داری سے ترقی کے پہیے تیز تو ہوئے لیکن اس کے فوائد صرف ایک خاص طبقے تک محدود رہتے ہیں۔ پھر سرمایہ دارانہ نظام اپنے ساتھ سماجی بے ایمانی، رشوت ستانی لاتا ہے۔ جاپان، امریکہ، انڈونیشیا کی طرح یہاں پر بھی کھلی عیال داری چل رہی ہے۔ امریکی تسلی دیتے ہیں کہ یہ ترقی کی قیمت ہے۔ یہ لاطین امریکہ کا تیسرا گنجان ملک اپنے محدود ذرائع اور صنعتیں لے کر بھی عوام کو پورے حقوق نہ دے سکا۔ سماجی اور طبقاتی امتیاز یہاں بہت کیا جاتا ہے۔ بڑی بڑی جاگیریں جن کو "حیسی اینڈا" HACIENDA کہا جاتا ہے۔ انیسویں صدی تک دیہی اکثریت کو اپنے پنجوں میں جکڑے ہوئے تھیں۔ غریب مزدوروں کو طرح طرح کی بندشوں اور قرضوں میں مقید رکھتی تھیں تاکہ بھاگ نہ سکیں۔ شہروں میں بدنظمی اور بیروزگاری عام تھی۔ اس لیے میکسیکو میں صرف دو طبقے تھے۔ بے حد غریب یا بے حد امیر۔ اب پچھلے تیس سال میں متوسط طبقہ ابھرنے لگا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ طبقہ صرف ۲۰ فی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ

چھوٹے دیہاتی زمیندار RANCHEROS اپنی اپنی زمین بیچ کر شہروں میں آن کر بس گئے ہیں اور کاروباری بن گئے ہیں۔ ان کے شمار سے کچھ متوسط طبقے میں جان آگئی ہے۔ حکومت نے ایک قابل تحسین کام کیا ہے کہ سرکاری ملازمین کے لیے بے شمار سستے گھر بنا دیے گئے ہیں لیکن یہ صرف آٹے میں نمک والی بات ہے۔ ورنہ غریبوں کو اب بھی انصاف نہیں ملا۔ دیہاتوں میں اگر ان کی روایتی شریکے والی زمینیں EJIDO نہ ہوتیں یا قدیم انڈین نظام یعنی مشترکہ امداد باہمی کے اصول پہ ملکیت نہ ہوتی تو یہ معصوم عوام گرگ زمینداروں اور پادریوں کے جبڑوں میں پھنسے ہوتے۔

کاردناز CARDENNAS کو خدا جنت نصیب کرے جس نے کم سے کم شروع میں میکسیکو کے منہ کو سوشلزم تو لگایا۔ دہقانوں کو ملکیت دے کر وقار دیا "لیبر یونین" قائم کیے۔ ۱۹۳۸ء میں سب تیل کی کمپنیوں کو قومیا کر امریکی اجارہ داری ختم کی۔ "کاردناز نے قومی فخر کو دوبالا کیا۔ مگر افسوس کہ تجارتی طاقتوں نے اس کے ہاتھ روکنے شروع کیے اور اس کا اثر زائل کر کے قدامت پسند عناصر کو ابھارا۔ پھر رومن کیتھولک "جنرل کماچو" برسرِاقتدار لایا گیا۔ جس نے سرمایہ داری اور گرجا دولتوں کو از سرِنو تازہ کیا اور جب سے اب تک انہی خطوط پر "پالیسی" وضع ہوتی آئی ہے۔ موجودہ صدر "دیاز اوردیاس" کا ایک سال باقی ہے۔ امریکہ ان سے خوش ہے اس لیے مغربی صحافت بھی ان کی قصیدہ گو ہے۔ جس کو پیا چاہے وہی سہاگن۔

ایک شام ہم نے وزارتِ زراعت کے سیکرٹری اور ان کی بیگم کے ساتھ گزاری۔ انہوں نے از سرِنو شہر کی سیر کرائی، پُرتکلف ریستوران میں کھانا کھلایا۔ ہمارے فوٹو کھنچوائے۔ ان سے باتوں باتوں میں بہت معلومات حاصل کیں۔ مثلاً یہ کہ یہاں عورتیں بہت آزادی پا چکی ہیں۔ سفیر اور ڈپٹی منسٹر بن چکی ہیں۔ تعلیمی نظام میں ۹۰ فیصد، ڈاکٹری میں ۲۵ فی صد چھائی ہوئی ہیں میں نے اپنے میزبانوں سے انگریزی محاورے میں پوچھا کہ "آپ میں سے کون گھر میں پتلون پہنتا ہے"۔ سیکرٹری صاحب فوراً بولے میں! میکسیکو میں میری ذات راج کرتی ہے۔ یہی پتہ چلا کہ

گھر میں مرد مطلق العنان ہے اور عورت کی عموماً کچھ نہیں چلتی۔ یہ مردانیت بھی اس ملک میں عجیب وغریب معمّہ ہے۔ یہ ایک فلسفہ ہے۔ ایک طریق حیات ہے۔ ایک مذہب ہے بڑے نفسیاتی ماہرین نے اس کا تجزیہ کیا۔ ہسپانوی "ہنا" "شی ولری" اور انڈین آبرو دنز اکت احساس کا یہ مرکب "ماچی سما" MACHISMA کے نام سے سارے لاطینی امریکہ میں مشہور ہے وہ کیا شے ہے جو ایک میکسیکی کو پل بھر میں لڑنے مرنے پر اور دوسرے لمحے عورت کے قدم چومنے پر تیار کرتی ہے۔ بزم میں چھیلا بن کر کبھی رزم میں سورما بن کر نکلتی ہے کوئی ماہر قیاس آرائی کرتا ہے کہ "ماچی سما" اپنے آپ کو مرد ثابت کرنے کی ایک مسلسل کوشش ہے۔ یہ ماچیسما" نوبت کا بھی پروردہ ہے۔ ایک شرابی ماچو اپنی بیوی کو ٹھونکے گا کہ پیسے کیوں مانگے۔ چلتی کار پر گولی چلائے گا کیونکہ اس کے پاس کار نہیں ہے۔"

البتہ اس ماچسمو کے شوخ زاویے بھی ہیں۔ ایک مرد کی کسی چلتی عورت سے ٹکر ہو جائے تو بجائے معافی مانگنے کے وہ کہے گا "کیا خوب" کسی اجنبی سیمیں بدن کے سامنے دوزانو ہو کر کہے گا۔ "جب سے تم زندگی میں آئی ہو۔ میری جان لیوا بیماری دور ہو گئی ہے۔ میری ماں کو خبر دے دو کہ پریشان نہ ہو، اب میں بچ گیا۔"

میکسیکو نے صدیوں کی خوں فشانی اور خانہ جنگی کے بعد یہ سبق سیکھا ہے کہ سیاسی استحکام بہت ضروری ہے۔ اس لیے ہر قومی صدر کو چھ سال کا کھلا چھٹا ملتا ہے لیکن وہ چھ سال کے بعد دوبارہ نہیں چنا جا سکتا۔ اس لیے یہ لوگ خوش ہیں کہ ان کا صدر دوبارہ الیکشن کے لیے داؤ پیچ میں نہیں پڑتا۔ دوسرے یہ کہ سارے ملک میں ایک مضبوط پارٹی۔ پی، آر، آئی (P.R.I) ہے جو انقلابی نعروں پر ووٹ حاصل کرتی ہے۔ حالانکہ اب اس کے پروگرام انقلابی بالکل نہیں رہے پھر بھی ہر مخالف پارٹی عوام کے قریب نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس کے نام میں انقلاب نہیں ہے اور انقلاب کے نام پر میکسکی عوام جان دینے کے لیے تیار ہے۔ اس لفظ سے ان کی ۔ ریخی یادیں وابستہ ہیں۔ جس طرح ہماری دولوں لگیں "مسلم" کا لفظ نہیں ہٹا

سکیتیں۔ اسی طرح "پی آر آئی" لفظ "انقلاب" نہیں ہٹا سکتی۔

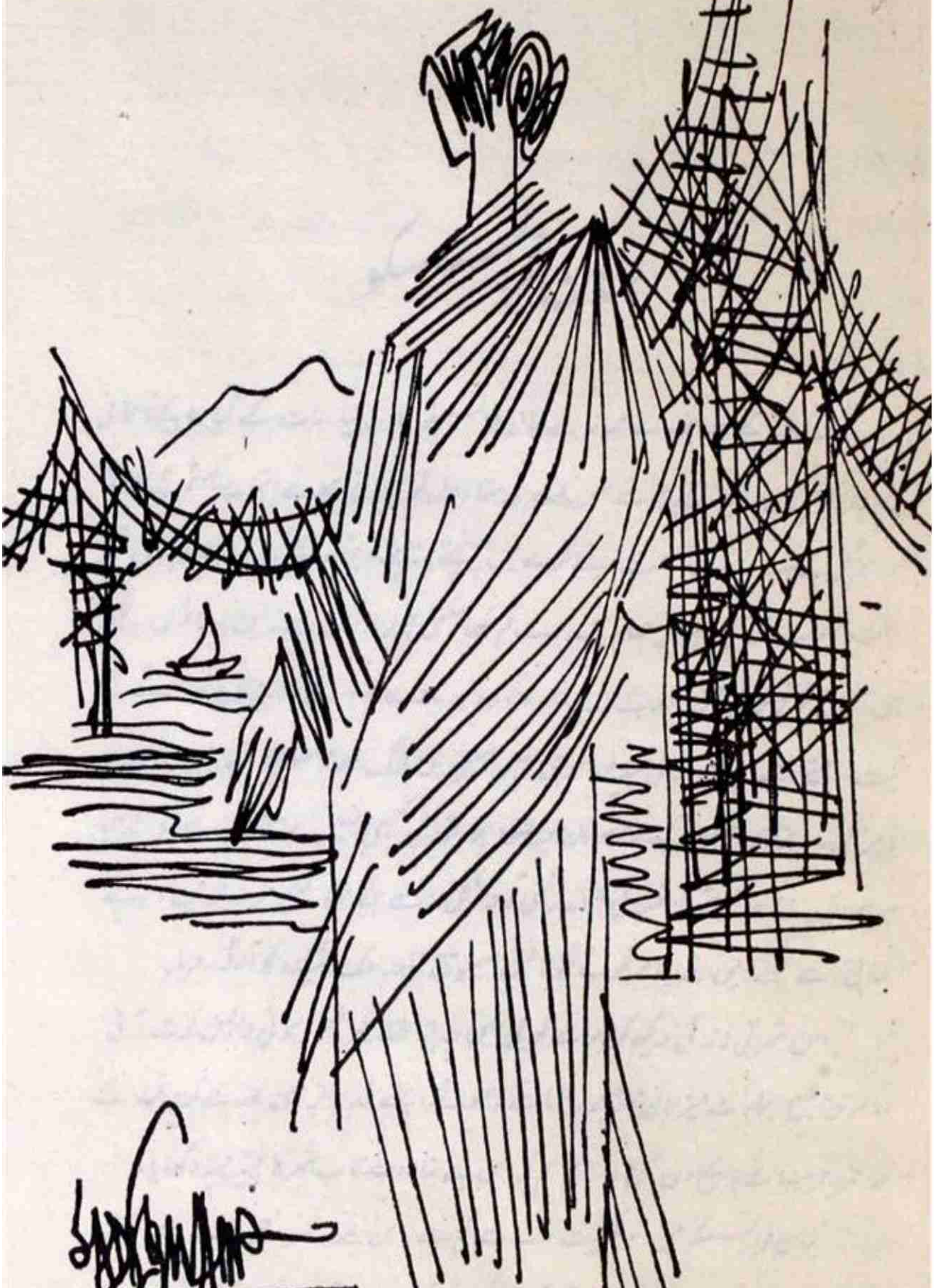
دوسری قابل ذکر سوشلسٹ پارٹی ہے جس کا لائحہ عمل وہی ہے جو لوگ چاہتے ہیں۔ لیکن اس کو ابھرنے کی اجازت نہیں۔ ایک جذبہ لاطن امریکہ میں نمایاں اکثریت پکڑ گیا ہے اور وہ ہے "اینٹی گرنگوازم ANTI GRINGOISM "گرنگو" وہ شمالی امریکن یعنی "یے نکی" YANKEE کو کہتے ہیں اور حقارتاً استعمال کرتے تھے۔ یہ جذبہ عام ہے اور جائز ہے۔ امریکن ان کی زمین کھا گیا۔ زر کھا گیا اور اب بھی لاطن امریکہ کو سیاسی اور اقتصادی بیڑیوں میں جکڑنا چاہتا ہے۔ ہر جگہ امریکن اکڑ کر چلتا ہے۔ زور سے بولتا ہے، پٹخ کر پیسے پھینکتا ہے۔ لاطن امریکی پیسے جھک کر اٹھاتا ہے اور "یے نکی" کی پیٹھ مڑتے ہی اس پر لعنت بھیجتا ہے۔

میکسیکو اور پاکستان کے کئی پہلو یکساں ہیں۔ دونوں سابقہ غلام سامراج، دونوں زرعی، غیر ترقی یافتہ، دونوں تعلیم میں پیچھے لیکن کوشاں۔ ان کے پچیس فی صد بچے مدرسے تک نہیں پہنچے۔ قومی دولت بڑھ گئی ہے لیکن امیر غریب میں ابھی تک تفاوت تشویش کن ہے۔ مذہب کا غلبہ لوگوں پر مکمل طور پر ہے۔ کیتھولک دین نے خوبیوں کے ساتھ برائیاں بھی پھیلائی ہیں۔ انقلاب کے بعد لیڈروں نے اسی مذہب کو پشت پر ڈال دیا تھا۔ کیونکہ یہ عوام کی ترقی میں حائل تھا۔ ۱۹۱۷ء کے آئین نے گرجا کی تعلیمی، سیاسی اور اقتصادی کارروائیوں پر سخت ممانعت لگا دی تھی۔ لیکن حال کی حکومتوں نے اس لگام کو ڈھیل دے دی ۱۹۵۹ء کے بعد ۲۰ نئے گرجا بنے اور ۲۳ زیر تعمیر ہیں۔ گرجا پھر ایک سیاسی عنصر بن گیا ہے۔ اس کی دقیانوسی تربیت کی وجہ سے خاندانی منصوبہ بندی ٹھپ ہو گئی ہے۔ ہماری طرح میکسیکو کی آبادی ماشاءاللہ روز افزوں ہے۔ اس ملک کی بھی ساری اقتصادی ترقی دھری کی دھری رہ جاتی ہے اگر اس کا پھل کھانے والے دگنے تگنے ہو جائیں۔ ہمارے "ہین سیون" میں امریکہ کے کچھ پروفیسر آئے ہوئے تھے جو میکسیکو پر بہت کچھ تحقیق کر چکے تھے۔ ایک شام ان سے گفتگو میں بہت دلچسپ نکتے

نکلے۔ مثلاً یہ کہ ان کے نظریئے سے ایک خوش آئند شگون یہ ہے کہ عوام لکیر کے فقیر نہیں رہے۔ زمانے کے ساتھ بدلنا چاہتے ہیں۔ بجائے "تورتلا" کے تندور کی ڈبل روٹیاں کھاتے ہیں نیم حکیم خطرہ جان "کیوران دیرو" کے بجائے ڈاکٹر بلاتے ہیں۔ شہروں میں ٹیلی ویژن، گیس، نائلون، المونیم اور امریکی کارٹونوں نے ازلی طرز زندگی بدل ڈالے ہیں۔ جب ہمارے دیہاتوں میں بھی دھاتی کٹوروں اور آبخوروں کے بجائے پلاسٹک کے گلاسوں میں پانی پیا جاتا ہے تو اس تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ مجھے پاکستان اور میکسیکو میں کئی مشابہ حالات نظر آئے۔ میکسیکی کھانے کے مسالے اور مزے ہم سے قریب ہیں۔ ان کی دستکاریوں میں ہمارے نمونے ملتے ہیں۔

نسلی طور پر بھی ہماری طرح مخلوط ہیں۔ ہم دونوں تو ہیں "میس تیزو" MESTIZO کہلائی جاسکتی ہیں۔ نفسیاتی رو سے بھی ہم میں کوئی زیادہ فرق نہیں۔ ہماری طرح ان میں بھی ایک شاندار ماضی کی یاد زندہ ہے "پدرم سلطان بود" ان کا ردعمل بھی عموماً جذباتی ہوتا ہماری طرح تنک مزاج، گرم دل، دوست نواز نظر آئے، ہر جگہ ہماری خاطر تواضع بہت دل سے کی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ سست اور پابندئ اوقات سے آزاد رومان پسند لوگ ہیں۔ ان کے سارے آرٹ میں ان کی اندرونی قنوطیت عیاں ہوتی ہے۔ ان کے گئی گیت "پھوٹی قسمت پھوٹے کرم پر بنے ہوئے ہیں۔

ہماری طرح یہ تو ہمات پرست ہیں۔ میں ہوٹل کو خیرباد کہہ کر جب "ہین سیون" میں آکر بسی تو دوسرے ہی دن زبردست زلزلہ آیا۔ سوتے سوتے آتش فشاں نے غالباً کروٹ لی، یہ میکسیکو میں دس سال کے بعد پہلا ہولناک بھونچال تھا۔ اوپر کی منزل سے جو میں نے جھانکا تو ساری سڑک اور کاریں اس طرح ہل رہی تھیں جیسے رواں پانی۔ اسی وقت مالکِ مکان آدھمکے بولے "سینورا آپ کا آنا کچھ بدشگونی سے شروع ہوا ہے"۔ میں نے اشارہ سمجھ لیا اور ان کا کرایہ بڑھا دیا۔



سان فرانسسکو

سان فرانسسکو

"وین کوور" کے بعد ہمارے جہاز نے سان فرانسسکو کا رخ کیا۔ رات کے گیارہ بجے آسمانی ستاروں کو پشت پر چھوڑتے ہوئے شہر کے برقی ستاروں کو چیرتے ہوئے اترے کسٹم کے تکلفات ہوٹل کے غلط پتے کے باعث اپنے کمرے میں پہنچتے پہنچتے ڈیڑھ بج گیا۔ نہا دھو کر نکلی تو سخت بھوک لگی۔ میں ہوائی جہاز میں بہت کم کھا سکتی ہوں۔ اس لیے زمین پر پاؤں لگتے ہی آنتیں غرغر کرتی ہیں۔ دو بجے رات مجھ کو کون کھانا دے گا؟ بچے اور میاں تو سونے کی نیت رکھتے تھے۔ میں تو خالی پیٹ سو ہی نہیں سکتی۔ ڈائننگ روم سو چکا تھا۔ میں ہوٹل سے باہر نکلی۔ ساتھ ہی نکڑ پر ایک ریستوران پر لکھا ہوا تھا "یہ کبھی نہیں سوتا"۔ میں نے کہا "مرحبا! یہ ہے ایک زندہ دل شہر کی نشانی"۔ اندر گئی تو واقعی رت جگا تھا۔ کئی مرد، عورتیں، بچے کھا پی رہے تھے۔ میں نے اپنا مرغوب "ٹیونا فش سینڈوچ" اور ملک شیک کا آرڈر دیا۔

اس شہر کی زندگی دیکھ کر سونے کو جی نہیں چاہتا تھا! خیر تھکی ہوئی واپس لوٹ آئی۔

دوسری صبح ہمارے میزبان مسٹر موئر نہائے دھوئے اپنے قد برابر لمبی کار لے کر دس بجے حاضر۔ غریب نے پانچ دن صبح و شام ہم کو اس بے پناہ، بے تاب شہر کا چپہ چپہ دکھایا۔

سان فرانسسکو میں امریکینیت سب سے کم ہے۔ اس لیے یہ شہر مجھے سب سے زیادہ بھایا۔ امریکہ میں مجھے رہنے کی کوئی تمنا نہیں۔ لیکن اگر مجبوراً رہنا پڑے تو یہ ایک شہر ہے جہاں میں دو تین سال بتا سکتی ہوں۔ اس شہر کا نہ تو نیویارک کی دم بخت "مخلوق سے تعلق ہے جو

فلک پیما شکنجوں میں تجارتی دل رکھتی ہے نہ واشنگٹن کی سرکاری فضا سے مشابہت جہاں عموماً دفتری حبس اور سیاسی بیوپار چلتا ہے۔

سان فرانسسکو ایک شہر نہیں، شخصیت ہے اور اس شخصیت کا مخصوص پہلو انفرادیت ہے۔ امریکہ میں شمال سے جنوب تک ایک بیزار کن یکسانیت نظر آتی ہے۔ یہاں ایک تنوّع ہے۔ اس کے جغرافیے میں تنوع، معاشرے میں تنوّع۔ شہری خدوخال میں جدّت، باشندوں میں ہمہ گیرا ختلاف، یہ امریکہ ہے بھی اور نہیں بھی۔ اس شہر نے امریکہ کی لاج رکھ لی ہے یہ جتنا نیویارک کی فضا سے دور ہوتا جاتا ہے۔ اتنا ہی انسانیت کے قریب تر آتا جاتا ہے۔ انسان کی طرح یہ بھی ایک وقت میں سب کچھ ہے۔ فراخ دل، یہودی صفت، حسین، غلیظ، روشن، تاریک کبھی ہنگامہ خیز، کبھی خاموش۔ بیک وقت تخلیقی اور انحطاطی! متعصّب مگر پھر بھی روادار! اس کی کون تشریح کرے؟

اس شہر کی تاریخ ضعیف ہے۔ یہ خود جوان ہے۔ یہ اپنے افسانوی گذشتہ "طلائی تمدن" کو مُڑ مُڑ کر دیکھتا ہے۔ ذرا خاموشی سے سنیں تو اس کے سمندری ساحلوں کی بلند موجوں میں کئی شور پنہاں ہیں۔ شروع میں آبی پرندوں کے غولوں کا، پھر ازلی باشندوں کے منتروں کا، کبھی برطانیہ کے "سمندری کتوں" کا۔ کبھی قدیم مبلغوں کی کلیسائی گھنٹیوں کا۔

جب اس کی سرزمین پہ امریکی پرچم لہرایا اور ہسپانوی پرچم سرنگوں ہُوا تو قسمت سے سونا دریافت ہوگیا۔ گھاٹ گھاٹ کے منچلے قسمت آزمانے پہنچ گئے۔ برسوں لوٹ کھسوٹ مارکٹائی ہوتی رہی اور ابھی تو یہ محض ڈرامے کا آغاز ہے۔ اس شہر کی تلاش میں نکلیں تو شہر نہیں ملتا۔ اس کی شناخت کیسے کریں؟ ایک طرف حبشیوں کے حسرت کدے دوسری طرف چینیوں کے مخصوص محلّے۔ مغربی دنیا کا سب سے بڑا "چائنا ٹاؤن" یہاں ہے کھچا کھچ بھرا ہوا۔ ٹیلیفون ڈکشنری اٹھا کر دیکھو تو "لی دونگ فونگ" سے صفحے کالے۔ کہیں اطالویوں کے مخصوص طعامی اڈے اور اخبارات، کہیں چند سنکی کروڑ پتیوں کے خیراتی عجوبے اور فنی

ادارے۔ ایک چیز جو بالکل دکھائی نہ دی۔ وہ تھی ہسپانوی کلچر یا کم سے کم اس کے بچے کھچے نشان سوائے چند ہسپانوی ناموں کے (وہ بھی محض سڑکوں یا محلّوں کے) اور کوئی علامت اس معاشرے کی نہیں جو اس کا فرمانروا تھا۔ یہاں کے عجائب خانے بھی اس عہد پر عمداً خاموش ہیں غالباً اس کی یاد سے ان کے ضمیر کو تکلیف ہوتی ہے اور "میکسیکو" کا تو نام لو تو ہمارے ملنے والے نظر بچا کر موضوع بدل دیتے تھے۔ اس شہر کا سب سے نرالا راز یہ ہے کہ اس میں بے شمار ننھی پہاڑیاں ہیں اور ہر پہاڑی میں ایک مخصوص علاقہ بسا ہوا ہے۔ ان علاقوں کا ضروری نہیں کہ صرف شاہراہوں سے رشتہ ناطہ جوڑا جائے۔ کہیں رشتے کی کڑیاں آبی پل ہیں۔ کہیں سنگلاخی یا چوبی زینے۔ مجھے اس کی یہ ادا بہت پیاری لگی۔ یہ انفرادیت اور جگہ بہت کم پائی جاتی ہے مثلاً "ٹیلی گراف ہل" کے بل کھاتے ہوئے موڑ توڑ ہی کو لے لیجئے۔ یہ شہر کا قدیم ترین محلّہ ہے جس کے ساحلی غاروں میں "گولڈرش" GOLDRUSH کے اوّلیں اُچکے آکر بسے تھے اور اندھیر نگری چوپٹ راج مچایا تھا۔ اس وقت یہ سان فرانسسکو کا سب سے دشوار پہاڑی علاقہ ہے۔ جس کا تنوّع، بے ڈھنگا پن شہریوں کو بے حد محبوب ہے۔ اس کی بعض گلیاں اتنی تنگ ہیں کہ ایک کار مشکل سے گزرتی ہے (یہ امریکہ کے لیے عجوبہ ہے۔ جس طرح ہمارے ہاں گمٹی بازار و صرافے بازار میں ایک گاڑی نہیں گذر سکتی) بعض گلیاں ایک دم اونچائی پر شروع ہو جاتی ہیں۔ وہاں نہ سڑک نہ موٹر۔ پیدل چلیے۔ پتھروں کو کاٹ کر قدمچے بنے ہوئے ہیں۔ ایک گلی دنیا کی سب سے ٹیڑھی گلی کہلاتی ہے۔ اس میں پانچسو چھپتر بل ہیں۔ چلتے چلتے چکرا جاتے ہیں، بچّے وہاں خوب "کیڑی کاڑا" کھیلتے ہیں۔ اس محلے میں بھانت بھانت کے "کرخنداروں" کے شاہانہ فنون کی گیلریاں بھی ہیں۔ یہاں بیٹ نک کے غول کے غول نظر آئے۔ ڈاڑھیاں منکے، تعفّن، نغمے، بے حسی، جوانی، جنسی بد نظمی، گیتا، یوگا! احتجاج!! یہ ہے اس فسانوی نسل کا حُلیہ۔ یہ بوہیمین بیل جو پروان چڑھتے چڑھتے نامعلوم کتنے نام اور حُلیے بدلے گی فی الحال "ہپ" کہلاتی ہے۔ یہ ماحول کی ناانصافی پر جہاد کرنے کی بجائے راہِ فرار اختیار کرتی ہے۔

حکومتی عملے کو حقارت سے ESTABLISHMENT کہہ کر رد کر دیتی ہے۔ کسی بھی آئیڈیالوجی کو "معاشرتی دروغ" قرار دیتی ہے۔ ماپا کی کھوج کو "چوہوں کی دوڑ" کا نام دیتی ہے۔

ایک پہاڑی علاقہ روسی ہل RUSSIAN HILL کہلاتا ہے۔ اس روسی ہل کا "روسیاہوں" سے کوئی تعلق نہیں یہ "روسیاہ" کہیں اور بستے ہیں۔ اس علاقے سے تمام سمندر اور باقی پہاڑیاں نظر آتی ہیں۔ اس کی بھی سڑکیں اکثر غائب ہو جاتی ہیں اور موٹر روک کر پاپیادہ چڑھائی کرنی پڑتی ہے۔

NABOB HILL مخفف ہے (NOB HILL) کا جہاں پرانے زمانے کے نواب ورڈ سار رہتے تھے۔ جنہوں نے یہاں اوٹ پٹانگ رنگ برنگے محل دو محلے بنا کر اس کو بھی ایک انوکھا علاقہ بنا دیا ہے۔

"پریزیڈیو" PRESIDIO دو صدیوں تک فوجی نظام کا گڑھ رہا ہے۔ اب اس کے ایک حصے کا پارک بنا کر پبلک کے لیے کھول دیا گیا ہے۔ اس میں ایک چشمہ ہے "ایل پولن" EL POLIN ہمارے دوست نے بتایا کہ یہاں کے اصلی انڈین باشندے اس چشمے کو افزائش نسل کی دیوی سمجھتے تھے۔ ہسپانوی عہد میں بھی اس کا پانی اسی لالچ میں پیا جاتا تھا۔ جس کی برکت سے فوجی جرنیلوں کے خاندان کبھی بارہ کبھی سولہ کبھی بیس بچوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ اب امریکی فوجیوں نے اپنے "اعمال" گننے بند کر دیئے ہیں۔

ہمارے دوست ڈاکٹر پال کی بیٹی نے ہمیں اس شہر میں مزید پیچ دینے اعصاب کا ڈھیر ہو گیا۔ امریکہ میں اسی میل کی رفتار سے کم کار چلانے والا مجرم یا مریض سمجھا جاتا ہے۔ سان فرانسسکو کی مشہور لاتعداد ہی شاہراہیں ایک وقت میں دس اطراف سے آکر ملتی ہیں اور آر پار ہو جاتی ہیں۔ امریکہ کی تند رفتاری اور تند ترقی کا راز یہی شاہراہیں ہیں۔ جو فولادی ڈھانچوں کی مدد سے تہہ بہ تہہ بنائی گئی ہیں۔ ان کی حرکت سے شہر اور اقتصادیات میں برکت ہے۔ ورنہ بے پناہ آبادی کے مدنظر ایک محلے یا کارخانے سے دوسرے مقام پر

جانے میں چیونٹی کی چال چلنا پڑتا ہے۔ ان شاہراہوں پہ چاروں طرف کاروں کی قطاریں دیکھ کر چکر آتے ہیں۔

تین اگر سر پہ سے زناٹے سے گذرتی ہیں تو پانچ پھر پاؤں تلے سے نکل جاتی ہیں۔ ہر کار زناٹے سے اُڑ رہی ہے اگر کم بخت ایک اڑے تو چالیس اور لے مرے۔

امریکہ میں اوّل تو گرامر سے خاصا مانوس ہونا پڑتا ہے۔ کیونکہ ہر چیز تصغیر کے برعکس تکبیر کے صیغے SUPERLATIVE میں پائی جاتی ہے۔ دنیا کی سب سے اونچی عمارت دنیا کا سب سے لمبا پل، دنیا کا سب سے امیر طبقہ، دنیا کی سب سے رنگین بیوہ۔ دنیا کا سب سے بڑا سینوتج، سب سے خطرناک بم۔ سب سے زیادہ بجٹ۔ غرضیکہ اعداد و شمار کی گردان سُن سُن کر آپ کی ساری شخصیت، آپ کا ملک و معاشرہ ایک اسم تصغیر بن کر رہ جاتا ہے آپ سوچتے ہیں کہ کہاں ان دیوزادوں کے ملک میں پہنچ گئے۔

اس شہر کا اصلی ہیرو تو میں بھول ہی گئی۔ جس کی وجہ سے سان فرانسسکو عالم میں تشہیر پا چکا ہے۔ وہ ہے "گولڈن گیٹ برج" اس طلائی پل کے فوٹو ہر موسم میں، دھوپ کے ہر گھٹتے بڑھتے لمحے میں ہر زاوے سے اترتے ہیں۔ واقعہ ہے کہ یہ دنیا کا سب سے حسین اور لمبا پل، انجینئرنگ اور سائنس کا کارنامہ ہے۔ لیکن جس طرح پیرس میں "سی این" SIENE اور لندن میں "واٹرلو برج" کی اپنی اپنی جگہ ہے۔ تو یہ پل بھی امریکی ادب میں ایک اہم باب بن گیا ہے اور اس کی فضا کا ایک مخصوص کردار ہے۔

سان فرانسسکو اور نیویارک میں شدید قسم کی ثقافتی رقابت ہے۔ نیویارک میں ذخائر زیادہ ہوں گے۔ لیکن ذوق اس شہر میں زیادہ ہے۔ یہاں چار تھیٹر کمپنیاں ہیں۔ جب اعلیٰ آرٹ گیلریوں میں کوئی نمائش ہوتی ہے تو فٹ بال سے زیادہ بھیڑ یہاں ہوتی ہے۔ حالانکہ نیویارک کی آبادی یہاں سے دس گنا زیادہ ہے۔ لیکن ہر کونسرٹ میں ٹکٹ یہاں زیادہ بکتے ہیں۔ ٹیلیویژن پر سب سے پہلے تعلیمی اور معیاری پروگرام اس شہر نے شروع کئے۔ گو

اس نے ابھی تک کوئی بڑا فنکار پیدا نہیں کیا۔ لیکن فنکاروں کی جائے پناہ یہیں ہے اور کم سے کم وہ فضا رکھتی ہے جس میں آرٹ پروان چڑھ سکتا ہے۔ اس ثقافتی سبقت کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس شہر میں پولیس اور منصف سے پہلے لطیف ہنر داخل ہو چکے تھے۔ اس سے پہلے کہ قوانین امن واستحکام کا سبب بنتے یہاں ایک خانہ بدوش تھیٹر کمپنی نے قدم جما لیے تھے۔ جہاں وہ ایک رات سرکس اور ایک رات شیکسپیئر کے ڈرامے کرتی تھی (شیکسپیئر اور سرکس !! انا للہ وانا الیہ راجعون) اس پر مجھے ایک باسی لطیفہ یاد آگیا۔ امریکہ کے صحرانورد، نیم مہذب "ٹیکساز" کو پیسہ کمانے کا اتنا ہی شوق ہے جتنا گولی چلانے کا۔ بدقسمتی سے وہاں ایک شیکسپیئر تھیٹر جھومتا جھامتا پہنچ گیا۔ کھیل "اوتھیلو" شروع ہوا۔ حاضرین کو اس قدر پسند آیا کہ چلاّ نے "ڈرامہ نویس !! ڈرامہ نویس کو بلاؤ" اب کس کی مجال کہ یہ فرمائش پوری نہ کرے۔ غریب تھیٹر کا مالک ہڑبڑا کر خود شیکسپیئر بن کر سٹیج پر جو پہنچا تو تڑاخ سے ایک گولی اس کے سر کو لگی۔

اس کو کہتے ہیں فنون لطیفہ کی سرپرستی۔

جنوبی کیلے فورنیا کی مشہور یونیورسٹیاں "سٹین فرڈ" STANFORD اور "برکلے" BERKELEY ہیں۔ اسی شہر کے ہرے بھرے گردونواح میں میلوں کے پھیلاؤ میں علم کی دیوی سرسوتی نے پوری گمبھیرتا سے اپنے مندر چنے ہیں۔ مجھے "سٹین فرڈ" یونیورسٹی سے مخصوص دلچسپی تھی۔ ایک تو اس کا "یونانی تھیٹر" اپنی مرمریں نفاست کے لیے مشہور تھا۔ دوسرا اس کا ننھا سا عجائب گھر ننھا سا اس یونیورسٹی کے رقبے کے لحاظ سے ہے، ورنہ اس ملک میں "ننھی" کوئی چیز نہیں ہوتی)

یہاں پر دسویں صدی کا جاپانی کانسی میں "ادھی بدھا" سجا ہوا ہے۔ جس کے کشادہ چہرے پر نروان کھلا ہوا ہے۔ بہت سے بدھا دیکھے لیکن اتنا سکون کہیں نہیں دیکھا۔ یونیورسٹی کے چاروں طرف پروفیسروں کی حسین کوٹھیاں، باغ، ہماری ہوائی کے دوست "پلول خا" بھی

یہیں مقیم تھے۔ایک سبز ٹیلے پر ان کا بنگلہ امریکہ کے مشہور معمار FRANDLLOYD WRIGHT نے بنایا تھا۔ ہمیں اس معمر عالم منکسر المزاج شخصیت نے اپنا سارا گھر اندر سے دکھایا۔ ہر کمرے میں ملک ملک کے نوادر سجے تھے۔ اس کے بچے دونوں خوشحال ہیں۔ اس لیے یہ گھر غالباً قوم کے لیے عجائب خانہ بن جائے گا۔

میرا دل پھر حسرت سے بھر آتا ہے۔ تعلیم امریکہ کا غریب ترین پیشہ سمجھا جاتا ہے اور اس پر یہ ٹھاٹ ہیں کہ ڈاکٹر پال حنا کی ایک ایک کتاب پر ہی لاکھوں روپے رائلٹی آتی ہے میرا اس حسین گھر کو چھوڑنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ امریکی ناراض تھے کہ جنوبی کیلیے فورنیا کی یونیورسٹیوں کے معیار بہت پست ہو گئے ہیں اور یہ علمی ادارے نہیں رہے بلکہ طلبا ساخت کرنے کے کارخانے بن گئے ہیں۔ ان یونیورسٹیوں کی ڈگریوں کی بہت کم قدر ہے ''ہاورڈ پرنسٹن ییل'' تو کجا دوم درجے کی یونیورسٹیاں بھی انہیں خاطر میں نہیں لاتیں۔ لیکن طالب علم ہیں کہ ہماری طرح چلے آتے ہیں اور یہاں بھی کھچا کھچ بھرے ہوئے ہیں۔

خدا نے انسان کو جو ڈھالا ہو گا سو ہو گا۔ لیکن خود انسان نے خدا کو خوب گھڑا ہے ہر ملک ہر مذہب نے اسے اپنے رنگ میں رنگا۔ اپنے پیراہن میں ڈھالا۔ اس طرح پیغمبروں کی شخصیت معاشرے کے ساتھ ساتھ بدلتی گئی۔ افریقہ کے مسیح اور مریم کالے بھٹ۔ جاپانی بدھا نکٹا چپٹا۔ اسی طرح ہر ملک نے اسلام کو نئے اوتار میں پیش کیا۔ انڈونیشیا پر نامی دیویوں دیوتاؤں سے ملا دیا مدراس میں محرم الحرام کو دسہرہ بنا دیا گیا۔ ایران میں تقیہ کر کے فارغ ہو بیٹھا۔ نائجیریا، گھانا میں لوک توہمات میں پر دیا گیا۔ لندن میں کرسی میزوں پر سجدے ادا کیے گئے۔ امریکنوں نے بھی اسلام کے نام پر ایک نیا سوانگ رچایا۔ ایک طبقے کا کہنا ہے کہ کیونکہ ہم سیاہ ہیں۔ ہمارا اسلام بھی سیاہ ہے اور خدا بھی سیاہ۔ یہ ہیں بلیک مسلم BLACK MUSLIM ویسے تو امریکہ میں دو اور قسم کے مسلمان بھی ہیں۔ ایک احمدیہ دوسرے کلمیہ یا اسمیہ۔ یہ غلط سلط جو بھی ہو اسلام کی خدمت کر رہے ہیں اور صرف ان میں ایثار اور تبلیغ پائی جاتی ہے۔ انہی ہی کی جماعت اچھی

طرح منظم ہے۔ سان فرانسسکو میں سب سے بڑی اور اکلوتی مسجد انھوں نے ہی بنوائی ہے۔ دوسرے محض کلمے یا نام کے مسلمان ہیں۔ ان کا شجرہ نسب کیلیے فورنیا سے نکالو تو جا کر کیمبل پور پہنچتا ہے۔ ان میں حسب معمول عموماً پنجابی ہیں اور باقی پٹھان جنھوں نے پنجابیوں کی دیکھا دیکھی وطن سے باہر روزی تلاش کی۔ گذشتہ صدی کے عین اختتام اور پہلی جنگ عظیم کے آغاز تک ان کے غول کے غول رجن میں زیادہ تر کسان اور مزدور تھے اور کچھ بھگوڑے سپاہی، لدھیانہ، رہتک اور کیمبل پور سے روانہ ہو کر ہزار دشواریوں سے چالاکیوں سے سنگاپور اور ہونگ کونگ کے راستے کیلیے فورنیا پہنچے۔ کچھ سکھ شمال سے کینیڈا کے ذریعے داخل ہوئے اور امریکہ کے سب سے زرخیز صوبے میں بس گئے۔ جس کی زمین سے انہیں امید تھی کہ سونے اگلے گی اور پھلوں کے خوشے توڑے بغیر منہ میں آجائیں گے۔ لیکن ان معصوموں کے لیے عرش پہ بھی بیگار تھی۔ یہ سب مزدور بھرتی ہو گئے۔ کوئی تو سیب چن کر پیٹ بھرتا۔ کوئی ریل کی پٹڑی پہ پتھر کوٹتا۔ خیر ان سب نے جفاکشی اور کفایت شعاری سے کچھ پیسہ بچایا۔ پھر ہندوستان میں آزادی کی تحریک کی شروعات اور سرگرمیاں ان کے کان میں پڑیں۔ ہردیال، موتی لال نہرو، محمد علی، شوکت علی، گاندھی کے نام سے ان کے خون میں جوش اٹھا۔ ان میں سے کئی خاندانوں نے گاڑھے پسینے کی کمائی کا حصہ سیاسی جماعتوں خاص طور پہ کانگرس کو بھیجا۔ ہندو سکھ پہلے پگڑیاں پہنتے تھے۔ پھر جب شرمانے لگے خود پہننا چھوڑ دیں۔ لیکن بازار میں بیچنا شروع کر دیں۔ امریکن کوئی بھی عجوبہ ہوا سے خریدنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ان میں سے ایک مسلمان فضل محمد پہ خدا کا بہت فضل ہوا اس نے دو ہزار ایکڑ زمین "چکو" CHICO میں پٹے پہ لے کر آہستہ آہستہ جائیداد بنانی شروع کی۔ کہتے ہیں کہ وہ چکو شہر کی پاؤ جائیداد کا مالک بن گیا اور جب مرا تو امریکہ کا پہلا مسلم لکھ پتی تھا۔

ہندو سکھ عموماً آپس میں شادیاں کرتے تھے اور اپنی زبان پنجابی کو برقرار رکھتے تھے۔ البتہ مسلمانوں نے حسب معمول باہر شادیاں کیں۔ چراغ کی بیوی میکسیکی، جس کا نام ہسپانوی

فتح دین کی زوجہ عراقی، تیسرے کی اطالوی. غرض کہ خوب مسلم خون خلط ملط ہوا. مسلمانوں نے نہ صرف اپنا لباس بدلا بلکہ رسوم و آداب بدل ڈالے. میں نے ایک شام سان فرانسسکو کی مسجد کے قریب ایک گھر میں گذاری. جہاں اس قسم کے خاندانوں کے کچھ افراد ہم سے ملنے خاص طور پر جمع ہوئے تھے. ان کی پرانی اور نئی پود میں زمین آسمان کا فرق تھا. بوڑھوں میں کچھ حجاب تھا. انہیں ابھی تک "السلام علیکم" کہنے کی عادت تھی. ہمارے لیے کچھ بسانده آلو کا سالن بھی بنایا ہوا تھا. کچھ اسلام اور پاکستان کے لیے دبی دبی چنگاری بھی سینے میں تھی لیکن نئی نسل بالکل امریکی، بلکہ امریکنوں سے بھی زیادہ امریکی. لہجہ زبردست جو صرف ناک میں ادا ہو. وہی بالوں کی تراش. وہی تنگ پتلون، وہی سیاسی اور تعلیمی پرچار کے سے اندھا تعصب. ایک جوان فرماتے ہیں:

"سب ویت نامی اور "کورین" لوگوں کو مار دینا چاہیے. ہم کہاں تک ان کو کھلاتے جائیں. آخر امریکہ نے ساری دنیا کو پالنے کی قسم تھوڑی کھائی ہے". دوسرے بولے. کمیونزم ایک خطرناک اژدہا ہے. اس سے پہلے کہ ہم کو نگلے. اس کا سر کچل دینا چاہیئے."

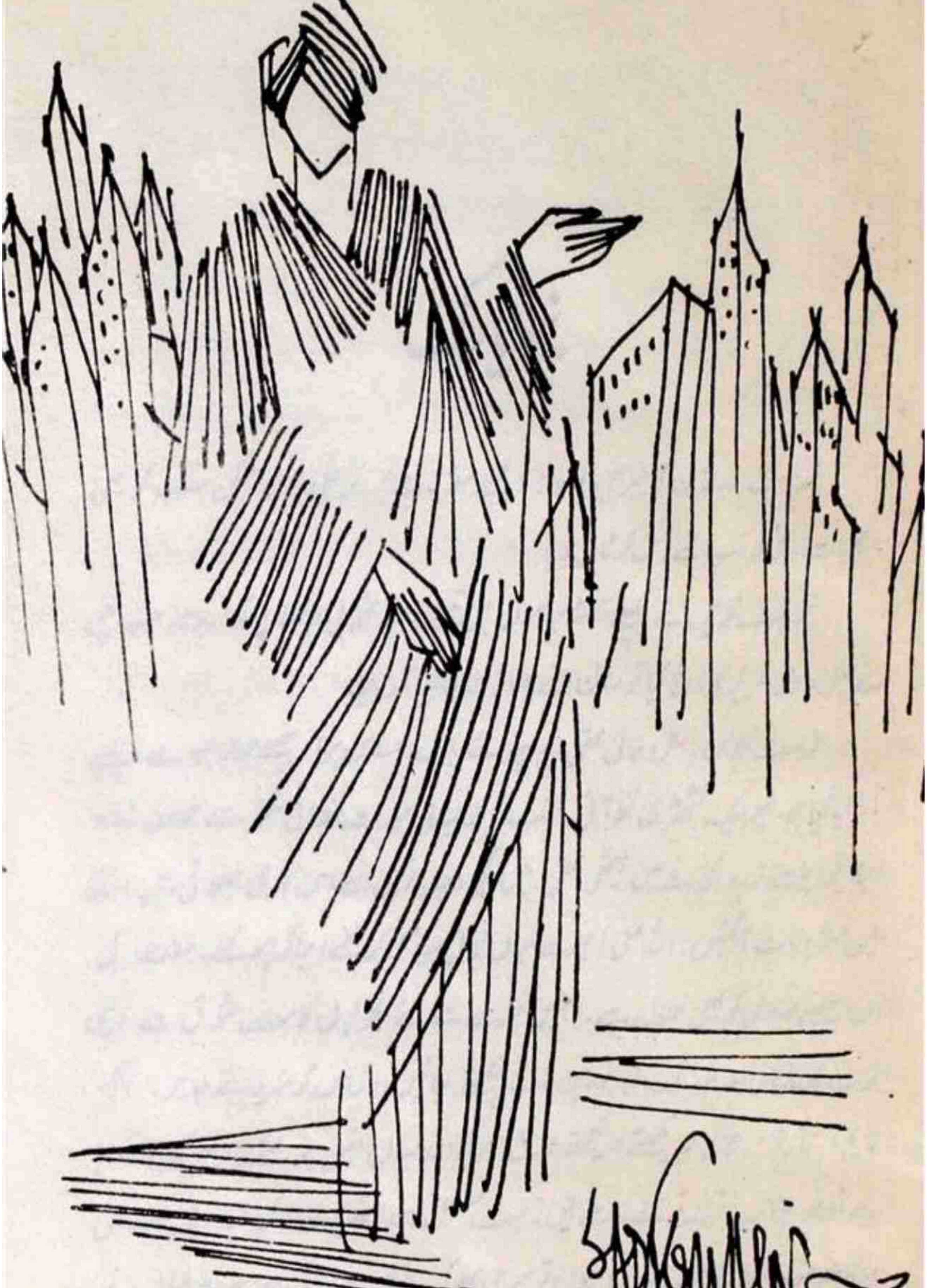
مجھے احساس ہوا کہ میں امریکی ٹیلیویژن دیکھ رہی ہوں. مجھے بتایا گیا کہ بعض درمیانی نسل کے ابھی تک کنوارے بیٹھے ہیں. اور "بڈھے چچا" کے نام سے چھیڑے جاتے ہیں. ان کی شادی ایک مسئلہ بن گئی ہے. میں نے ایک "انکل" سے پوچھا "کیوں"؟ بولے "شادی مسلمان ہی سے کرنی ہے. اپنے وطن کی ہم عمر نہیں ملتی. ایرانی لڑکی تیز ہے. عراقی صرف شہریت کے حقوق حاصل کرنے کے لیے مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے اور امریکی لڑکی مجھے حقارت سے دیکھتی ہے."

ان میں ایک خاندان بہت دلچسپ تھا. باپ کا نام "نیامت خان" (یہ اس لہجے میں ادا ہو رہا ہے جس میں بتایا گیا تھا) بیٹے کا نام "نیامتا جونیئر" بیٹی کا نام "مسز لولیٹا"، "مس آمنہ" یہ نیامتا سینئر ۸۰ سال کا چھیپ زدہ بڈھا تھا. جس نے تھوڑا سا کما لیا تھا.

کہ بڑھاپے میں اولاد کا دستِ نگر نہ ہو۔ آج ۴۵ سال بعد بھی سگریٹ اسی انداز میں پی رہا تھا جس طرح اپنے ضلع "انباڑے" میں سُوٹے مار کر گُڑگڑ پیتا تھا۔ کھانے کی میز پر سڑپے مار کر سوپ پینا شروع کیا تو بچے کچھ شرمندہ ہو گئے۔ لیکن نیامت خان کے کان اتنے لمبے تھے کہ سڑپ سڑپ کی آواز وہاں تک غالباً پہنچتی ہی نہ تھی۔ کونے میں اس کی موٹی نیم ہسپانوی بیوی بیزار سی بیٹھی اپنے ضخیم صوفے سے بھی باہر بہی جارہی تھی۔ بڈھے نیامتا سے امریکن معاشرہ دور سے بھی چھو کر نہیں گذرا تھا۔ اس کا لہجہ خاص اپنے وطن "انباڑے" کا تھا۔ گھر بالکل معمولی۔ کوئی سالم برتن نہیں غسلخانے میں تعفّن، لیکن باہر کار لمبی اور نئی۔ بیٹیاں فراکوں میں دم کٹی بٹیروں کی طرح بالکل اینگلو انڈین کی "مانک" غالباً داماد پیسے والا تھا۔ "نیامتا جونیئر" قابلِ رحم تھا۔ اسکول میں سفید امریکی، اس کے مذہب اور معاشرے پر جملے بازیاں کرتے تھے۔ یہ اپنے ماضی پر سخت نادم نظر آتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو اپنے مشرقی خون کو ہسپتال میں بدلوا دیتا۔ اپنے آبائی نام پر سفید چونا پھروا دیتا۔ کنکھیوں میں وہ اپنے "سوٹے" مارتے" ہوئے باپ پر شرمندہ ہو رہا تھا۔

ان مسلمانوں کا کوئی پرسان حال نہ ہوتا۔ اگر یہاں احمدی اور عرب مبلغ نہ پہنچتے ان کی تنظیم کے صدقے آج نہ صرف سان فرانسسکو میں ایک مسجد ہے اور چند نمازی ہیں۔ بلکہ "ایری زونا" کی یونیورسٹی میں بھی بقول "نیامتا جونیئر" کے ایک "مسلم گرجا" ہے۔ جہاں ۵۰ پاکستانی طلباء اور تقریباً اتنے ہی مسلم خاندان (مع عرب کے) بسے ہوئے ہیں۔ کچھ شکایات پاکستانی طلباء کے خلاف ہیں کہ وہ بدتمیز بھی ہیں اور مغرور بھی اور کیلیفورنیا کے مسلمانوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ یا عربوں سے حجّت کرتے ہیں۔ وہاں اسلامی مرکز میں بھی باقاعدہ وعظ ہوتے ہیں "الانوئے کی یونیورسٹی کی حدود میں پہلی ستمبر کو زبردست "مسلم کنونشن" منعقد ہونے والی تھی۔ جس میں تمام امریکہ کے مسلمان ہر نوع ہر رنگ کے اپنے واعظ اور مقرر بھیج رہے تھے۔ اس شام دو نوجوانوں سے اچھی بحث رہی۔ ان کا کہنا تھا کہ "اگر اسلام میں لچک

نہ آئی تو یہ مٹ جائے گا۔ فراک پہننے "منکی" ناچنے یا خنزیر کھانے سے اسلام ختم نہیں ہو جاتا" انھوں نے مثال دی کہ "حال ہی میں "سیکرامنٹو" کی مسجد کے ساتھ میں ایک "سمر اسکول" — SUMMER SCHOOL برائے مذہبی تعلیم کھولا گیا ہے۔ جہاں جوانوں کے لیے ہوسٹل کا بھی اضافہ ہوا ہے۔ اس "یوتھ ہوسٹل" میں امام ایک دن نیکر پہن کر لیکچر دینے آگیا، تو چند وضع دار مسلمان طلباء بگڑ گئے۔ برعکس اس کے جب اس سکول کے تالاب کے اوقات غسل لڑکیوں کے لیے الگ کر دیئے گئے تو خواتین "سیگری گیشن SEGREGATION" کا نعرۂ احتجاج لگا کر اس میں مردوں کے سامنے کود پڑیں۔ یہ ہے اسلام اور نئی روشنی کی ٹکر!



نیویارک

نیویارک

نیویارک اور لندن کا غیر سنجیدہ موازنہ پچھلے سفر ناموں میں کر چکی ہوں، لیکن سب کو یہی شکایات رہی کہ آپ نے ہنس کر ٹال دیا۔

نیویارک کو میں نے پچھلے آٹھ برسوں میں تین دفعہ بخوبی دیکھا، پرکھا، برتا۔ جب میں نے پہلی دفعہ امریکہ کا رخ کیا تو لندن سے جہاز الاطالیہ آزمایا۔

فرسٹ کلاس بالکل خالی تھی۔ ہم پسر گئے۔ یوں احساس ہوا، جیسے جہاز ہمارے لیے اُڑایا گیا ہو۔ پھر ایک گٹھڑی نظر آئی۔ ایک حاملہ لبنانی عورت فضائی سفر سے خوف زدہ ابکائیوں سے زرد، کونے میں بیٹھی تھی۔ میں کچھ دیر باتوں سے اس کا جی بہلاتی رہی۔ اتنے میں مشروبات آگئیں۔ اللہ غنی! میرے میاں ٹائی سیدھی کر کے اجاگر ہو گئے۔ مفت کی ان جیسے مولوی کو بھی حلال ہے۔ انہیں خیر سے نئے نئے تجربوں کا بہت شوق ہے۔ اپنی نوٹ بک نکالی اور ہر رنگ کی بلوریں ناب چکھتے جائیں اور اس کو نمبر دیتے جائیں $\frac{5}{10}$، $6\frac{1}{4}$، $7\frac{3}{4}$، $5\frac{1}{5}$ دیکھتے دیکھتے ورق بھر گیا اور میاں عین ہو گئے۔ ادھر کھانا آرہا ہے اُدھر جناب خراٹے لے رہے ہیں۔ بہت مشکل سے اٹھایا۔ کھانا کیا تھا ایک طعامی ہنگامہ تھا۔ انواع جب زیادہ ہوں تو میری بھوک غائب ہو جاتی ہے۔ میرے میاں نے سوچا کہ جہاز کی اطالوی حسین میزبان خاتون سے اطالوی چھانٹ جائے۔ ہجے بنا کر بولے AQUA MINERALE اس غریب کو ان کی اطالوی تو پلّے نہ پڑی۔ ستھری انگریزی

میں بولی" DO YOU WANT MINERAL WATER

میرے میاں جب کچے ہو جاتے ہیں تو میری طرف نہیں دیکھتے۔ کیونکہ میری ہنسی بھوت کی بیماری کی طرح جب ان کو لگے تو پھر وہ خود رکتے نہیں۔ اتنا ہنستے ہیں کہ اچھو لگ جاتا ہے اور میں اپنی ہنسی بھول کر ان کی پیٹھ پر دھموکے دیتی ہوں۔

چھ گھنٹے اطالوی عیش کے بعد جیٹ نیویارک پر منڈلانا شروع ہوا۔ پائلٹ جان کر چکر دے رہا تھا کہ ہم نیویارک کا رت جگا مکھڑا اچھی طرح دیکھ سکیں۔ کوسوں دور تک منور زینے آسمان پر چڑھتے چلے گئے۔ یہ نیویارک، امریکہ کا دروازہ، امریکہ کا اولین تعارف اس کے معاشرے کا مخصوص نمائندہ ہے۔ نہ جانے اس وقت کیوں یہ دعا نکلی۔

یارب! انسان کو اس مزین معاشرے کی تباہی سے بچالے جس کو اس نے صدیوں کی تگ ودو کے بعد اس معراج پر پہنچایا۔ کس جتن سے، کس کاوش سے انسان یہ کرشمے آباد کرتا ہے اور پھر کس بیدردی سے ان کو تباہ کر دیتا ہے۔ تیسری عالمگیر جنگ میں اگر نیویارک کے یہ فولادی فرعون گرے تو دم بخت انسانیت کہاں جائے گی؟

ہوائی جہاز اتر رہا تھا اور میرے خیالات کی ہولناکیوں میں مخلص عبادت پنہاں تھی۔

پہلی دفعہ ہمارا نیویارک سے تعارف کا شگون کچھ نیک نہ نکلا۔ سوائے موسم کے اور کسی چیز نے ساتھ نہ دیا۔ کفایت شعاری کے مدنظر زیرزمین ٹرین سے سفر کیا تو ٹیوب سٹیشن ایسے معلوم ہوئے گویا تاریک بھیانک زنداں۔ پھر طرح طرح کے منوتے آپ کے پیچھے سیٹی بجاتے اور آوازیں کستے ہیں اور دفتروں کے اوقات بعض اسٹیشن بالکل ویران ہوتے ہیں۔ مجھے لندن کی کسی ٹیوب میں ڈر نہ لگا۔ رات گیارہ بجے اکیلی آتی جاتی تھی۔ موسکو کے تو ٹیوب خیر مرمریں محلات ہیں۔ لیکن پہلی دفعہ نیویارک میں میری ستی گم ہو گئی اور توبہ کی کہ آئندہ ٹیکسی لوں گی۔

مختلف اوقات پر بازار میں ایک بار نہیں تین بار پیچھے راہ چلتے مردنے ٹھوکا دیا" میرے

ساتھ چائے پیو گی"؟ یا اس قسم کا مہمل سوال. سنٹرل پارک میں گئی سیر کرنے تو اسی دن مجھ سے پہلے کسی افریقہ کے سفیر کا بٹوہ دن دہاڑے پستول دکھا کر چھین لیا گیا تھا. لعنت اس پارک پر! ڈر کے مارے واپس لوٹی اور حسرت سے لندن کے پارک یاد کرتی رہی.

۱۹۶۰ کا بہترین ڈرامہ TOYS IN THE ATTICE چل رہا تھا. سب سے آخری نشست کا ٹکٹ پانچ ڈالر کا لیا. ٹھوہا دکرہا اور نہ صرف اپنا بلکہ دوستوں کا بھی اور سارے وقت ۲۰ ڈالر کو پانچ روپے سے دل ہی دل میں ضرب دیتی رہی اور ضرب کھاتی رہی اور پھر ڈرامہ بھی وہ کہ سوائے چیخ و پکار اور جرم اور نفسیاتی اختراع کے اور کچھ نہیں۔ یوں لگا کہ "للین ہیلمن" ڈرامہ نویس نے "ایگے تھاکرسٹی" اور "ٹینیسی ولیم" کو ایک کٹوڑ دان میں ڈال کر خوب ہلایا اور جو مرکب نکلا اس کا کھیل گھسیٹ ڈالا. اگر انگلستان اور یورپ اپنے بہترین تھیٹر یہاں نہ بھیجے تو "براڈوے" سر کے بل بیٹھ جائے ۔! خیر پھر "ریڈیو سٹی ہال" کا شو بھی دیکھا جو ہر سیاح کے لیے فرض ہے. جتنی بتیاں اتنی اتنی پیاری پیاری نسوانی لاتیں" لیکن کوئی خاص بات نہ بنی اس سے بہتر تو جاپان کے شو ہوتے ہیں. جن میں ایک جدت ایک نفاست ہوتی ہے.

اگر مجھے اس دفعہ کوئی چیز بھائی تو گرینچ دلیج" یہاں پر کچھ نئی فضا، نئی انفرادیت محسوس ہوئی. بعض ڈاڑھیاں البتہ کرائے کی معلوم ہو رہی تھیں. جس سے شک ہوا کہ یہ بھی سیاحوں کے لیے ایک مزید پھندا ڈالا ہے. یہاں کے ریستوران اور تھیٹر دونوں سستے بھی ہیں اور دلچسپ بھی.

مجھے چونکہ باقی امریکہ دیکھنے کا شوق تھا. اس لیے سراکیوز روانہ ہوگئی جو میرے لیے امریکہ کا سب سے خوشگوار تعارف ثابت ہوا. بہر حال نیاگرا، شکاگو، واشنگٹن کا چکر کاٹ کر پھر نیو یارک پہنچی اب کے اطمینان سے رہی. خوب گھومی، خوب خاک چھانی. لیکن پھر بھی اس بے ہنگم شہر کو سمجھ نہ پائی.

نیویارک ایک بے سرو پا دیو ہے۔ یہاں پہنچتے ہی انسان بوکھلا جاتا ہے۔ یہاں سب کچھ ہو سکتا ہے اور کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ شہر ہم جیسے انسانوں کے لیے بنا ہی نہیں۔ یہاں تجارتی مشینیں، کاروباری کارندے، اشتہاری پرزے اور سیاسی بہروپیے رہتے ہیں۔ یہاں پارک "ایونیو" کی کیتھرا مارت "ففتھ ایونیو" کی جلوہ گریاں اور "ہالم" کی حبشی محرومیاں بستی ہیں۔ اس کے عماراتی اور فنی کارنامے بیان کیے جائیں تو انسانی سعی کا قصیدہ مرتب ہو جائے گا۔

اس کے ہزاروں باسیوں نے کبھی سورج کی شکل نہیں دیکھی۔ وہ زیر زمین ٹرین سے آئے۔ زیر زمین دفتروں میں کام کیا۔ وہیں کھایا پیا اور وہیں سے شام کو لوٹ گئے۔ اس نیویارک کی نسلی کھچڑی کا یہ کہنا ہے کہ یہاں روم سے زیادہ اطالوی رہتے ہیں۔ کیو KIEV سے زیادہ روسی، ڈبلن سے زیادہ آئرش۔ اسرائیل سے زیادہ یہودی اور سین آوان" SAN JUAN سے زیادہ "پورٹوکن" مقیم ہیں۔ اس شہر کی "امریکی" زبان کا "بادشاہی انگلش سے مطلق کوئی تعلّق نہیں۔

اس لیے اس کے متعلق ایک لطیفہ مشہور ہے کہ "دوسو سال ہوئے فیصلہ ہوا تھا کہ انگریزی امریکہ کی قومی زبان ہو۔ ابھی تک یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ اس فیصلے پر عمل کیوں نہیں ہوا۔ سوائے تاریخ کے نیویارک کی کوئی چیز پست قامت نہیں ہے۔ بھلا ہو ایک ڈچ جہازراں ہڈسن کا جس نے مشرق کا راستہ کھو کر نیویارک دریا کو پالیا اور اب یہ دریا اس کے ہی نام پر ہے۔ اس کے دہانے پر ایک ننھا سا جزیرہ "من ہیٹن" جسے ڈچ نے انڈین باشندوں سے کل ۲۴ ڈالر میں خرید لیا اور اس کا نام "نیو ایمسٹرڈیم NEW AMSTERDAM رکھا اور اپنا پرچم گاڑ دیا۔ اللہ غنی! آج اسی جزیرے میں ایک کتّے کی غذا پر ۲۴ ڈالر خرچ ہوتے ہوں گے۔

سترھویں صدی میں جب انگریزوں نے اس کو فتح کیا تو اپنے شہزادے "ڈیوک آف

یارک" کے نام پر اس کو" نیویارک" کا لقب دیا۔ کچھ سال بعد ڈچ نے پھر اس پر قابو پالیا۔ لیکن جاوا سماٹرا کے بدلے میں انگریزوں کو جزیرہ واپس کر دیا۔ کہاں جاوا، کہاں نیویارک ڈچ سر پکڑ کر روتے ہوں گے۔ نہ یہ رہا نہ وہ رہا۔ اور اصل میں آہ و زاری تو کرتی ہو گی اس انڈین کی روح جس نے اسے ۲۴ ڈالر میں بیچا تھا۔

واشنگٹن سے پہلے نیویارک امریکہ کا دارالسلطنت تھا۔ جہاں اس کے پہلے صدر نے حلف اٹھایا تھا۔ اس شہر کا میری رائے میں تو تاریخی سنگ میل ایک ہی ہے اور وہ ہے اولیں ایلی ویٹر کی آمد۔ جس نے ۱۸۵۷ء میں ہماری طرح غدر مچا دیا۔ اس کا آنا تھا کہ شہر اپنے سر کے بل ابھرنا شروع ہوا اور ستاروں سے سرگوشیاں کرنے لگا۔

جتنا اس شہر پر دھن برسا اتنی ہی ثقافت کی درآمد ہوتی گئی۔ اب اس کو" کائنات کو چک" کہتے ہیں۔ اس میں کیا نہیں ملتا؟

آپیرا، تھیٹر، شبینہ کلب، ڈسکو تھیک، فیشن کی تجربہ گاہیں۔ فنون کے" سلون" آف" براڈ وے" آزاد انفرادیت کے نقار خانے۔

نیویارک کو امریکہ کا" بیٹ نک" شہر بھی کہتے ہیں۔ بقیہ شہر اس پر رشک کرتے ہیں اور پھر بھی ظاہر کرتے ہیں کہ گویا اس سے متنفر ہیں۔ لیکن چوری چھپے اس کی تقلید بھی کرتے جاتے ہیں۔ مجھ سے اکثر امریکن دوست اور ملاقاتی خاص طور پر مغربی ساحل پر پوچھتے تھے" آپ نے کونسی خاص بات نیویارک میں دیکھی جو اتنا وقت وہاں ضائع کیا۔ نیویارک تو امریکہ نہیں"! میرا تو سوال ہے:" پھر امریکہ کدھر ہے"؟ میری نظر میں تو "نئے نئی معاشرے" کا سب سے مستند پرچم بردار نیویارک ہے۔

اس شہر کے تضاد بھی انوکھے ہیں۔ نہ امارت سنبھالی جائے نہ غربت۔ اس شہر کے میئر لنڈ سے کا کہنا ہے کہ نیویارک کو" پیٹر پین کو مپلیکس" PETER PAN COMPLEX ہے۔" یہ پختگی سے کتراتا ہے۔"

یہاں ہر وقت توڑ پھوڑ چل رہی ہے۔ نقشے بنتے اور بگڑتے ہیں۔ ایک اور چیز کا یہاں احساس ہوا۔ وہ ہے وقت۔ گھڑیاں! گھنٹیاں! جنتریاں! سب پریشان ہیں اس آمریت سے۔ وقت سکڑ کر یہاں تولوں، ماشوں اور رتیوں میں بکتا ہے۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ وقت بلیک مارکیٹ میں بھی بکتا ہوگا۔ کیونکہ اس کی یہاں سخت کمی ہے۔ جس کو دیکھو سانس پھولا ہوا بھاگ رہا ہے آج کا نیویارک نہایت غیر آرام دہ ہے۔ میں نے اس کے سرد و گرم دیکھے ہیں۔ اندر کمروں میں سارے وقت مصنوعی موسم برقرار رکھے جاتے ہیں۔ اتنی ٹھنڈک نتیجہ یہ کہ گرمی میں اندر آپ کو نمونیا ہو جائے اور سردی میں اندر اتنا گرم کہ پسینے چھوٹ جائیں۔ سڑکوں پر خاصی غلاظت اور مکھیاں۔ مہنگے "منک کوٹ" میں امیر عورتیں کھلے گڑھوں سے بچتی، کوڑے کرکٹ سے کتراتی۔ ائرکنڈیشنڈ کاروں میں جا کر بیٹھ جاتیں۔ یہ تضاد بھی عجیب ہے۔ میونسپل کمیٹی غریب ہماری طرح بے بس ہے۔ دن دہاڑے یہاں چوری اور قتل و غارت ہوتے ہیں۔ آپ کسی دوست کے فلیٹ میں گھنٹی بجائیے تو وہ دروازہ نہیں کھولتا۔ بلکہ ننھے سے مخصوص سوراخ سے جھانک کر پہلے آپ کو جانچتا ہے۔ ہمارے ٹیکسی ڈرائیور نے بتایا کہ وہ اب سواریوں کے بیچ میں گولی سے بچنے کے لیے "بلیٹ پروف" شیشے لگوا رہا ہے"۔ میرے خیال میں نیویارک مغرب کا سب سے عشرت پسند "سانحہ کدہ" ہے۔

نیویارک کا پانی کھاری اور موسیقی فراری قسم کی ہے۔ ہوائی جہاز، دکان، موٹر سکول، کارخانہ، عجائب گھر، غالباً قبرستانوں میں بھی ٹرانزسٹر چل رہے ہیں اور سارے وقت دھیمی دھنیں بج رہی ہیں۔ یہ موسیقی ایک صوتی چکنائی کی طرح کان میں بھری رہتی ہے تاکہ بقیہ شور اس پر پھسل کر گر جائے۔ قبرستان پہ یاد آیا کہ امیروں کو اگر مرنا ہو تو امریکہ جا کر اپنے کو بک کرائیں۔ وہاں موت بھی ایک فنکارانہ بزنس ہے۔ مشہور ادارے صرف امیروں کے جنازے سجانے اور ان کے سر اور پیر میک اپ سے سنوارنے

کے لیے زبردست اشتہار بازی کرتے ہیں۔ جس کا خاکہ ایک انگریز مزاح نگار نے یوں اڑایا ہے۔

"ایسا جنازہ جس پر آپ خود پھڑک جائیں" ایک اشتہار یوں لکھتا ہے۔ "ہمارے پاس آیئے۔ ہم آپ کو بہتر گاڑیں گے"۔

اس دفعہ چونکہ ہم نے امریکہ کا سفر ہر رخ ہر پینترے سے کیا تو نیویارک ہمارا آخری پڑاؤ تھا۔ نیوارلین ڈٹرویٹ شکاگو سمو کی پہاڑ ٹینسی ویلی پروجیکٹ وسٹن کا چکمہ کاٹ کر واشنگٹن پہنچے۔ دعوتیں اور سیریں ہو رہی تھیں کہ کشمیری محاذ کی خبریں پہنچنی شروع ہو گئیں۔ طبیعت پر ہلکا سا بوجھ آگیا۔ نیویارک میں میرا دیور "یو۔ این" (U.N) میں تھا۔ اس کے فلیٹ پر پڑاؤ ڈال دیا۔ بچے نیویارک کے لیے بے تاب تھے۔ لیکن ہم نے سوچا کہ پہلے انہیں نیاگرا آبشار دکھا دیں۔ ہماری نئی کار اسی دن سات ہفتے کی مایوں کے بعد گیراج سے نکل کر آئی تھی۔ اس کو بھی چلانے کا شوق تھا۔ ہمارے عزیز امریکی دوست کارل شمتھ جو "سراکیوز" یونیورسٹی کے معزز پروفیسر ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں امریکہ کے مشہور "ہزار جزیرے" دکھانے کا وعدہ کیا تھا جو نیاگرا آبشار کے راستے میں آتے ہیں۔ ہم سب ہنستے گاتے دو سو میل پر پہنچے۔ ان کا ذاتی نیا بنگلہ "سینٹ لارنس" جھیل کے ساحل پر بننے والا تھا۔ نہایت پر فضا مقام تھا۔ وہاں پر انہوں نے ہمیں پکنک لنچ دیا۔ وقت کی کمی تھی اور ان جزائر کو دیکھنے کے لیے فرصت چاہئے تھی۔ اس کے علاوہ ہم اتنے جاذب قدرتی مناظر دیکھ چکے تھے کہ ان میں کوئی بات نظر نہ آئی۔ اس رات ہم ٹھہر کر دوسری صبح نیاگرا آبشار پہنچے۔ اس آبشار کے دو رخ ہیں۔ جب امریکن رخ سے دیکھیں تو دھوبی گھاٹ معلوم ہوتا ہے لیکن کینیڈا کی طرف سے آبی حسن کا سامراجی رعب، اور اس پر پھولوں اور صفائی نے مزید نکھار پیدا کر دیا ہے۔ ویسے بھی نیاگرا میں پہلے دیکھ چکی تھی۔ جب تک نیچے کشتی MAID OF THE

MIST میں نہ جاؤ۔ اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ دنیا کی سب سے چوڑی آبشار ہے۔ نیچے اس کے پیروں میں جاکر روانی اور طاقت کا پتہ چلتا ہے۔ ہم نے جونہی چنگی پر اپنی کار کا ٹکٹ لیا تو کھڑکی کے پیچھے کینیڈین بولا" آپ کو معلوم ہے۔ ہندوستان نے لاہور پر حملہ کر دیا!" یا اللہ خیر!! محسوس ہوا کہ کسی نے روح سلب کر لی ہے۔ میں تو وہیں کار میں بیٹھی رہی۔ کس کی سیر اور کہاں کی آبشار۔ بچوں کو ریاض صاحب جلدی جلدی پھرا لائے۔ یا اللہ لاہور میں اس وقت کیا حشر ہو گا۔ رشتے داروں، عزیزوں اور دوستوں سب کی شکلیں نگاہوں کے سامنے آگئیں۔ پھر اپنے مانوس علاقے ماڈل ٹاؤن "جی۔ او۔ آر" یاد آگئے۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یارب! کیا ان کی سڑکوں پر سکھ ٹینک چلائیں گے۔ دعا مانگ مانگ کر زبان خشک ہو گئی۔ تیسرے پہر ہم مارم مار روانہ ہوئے صرف ۲۰ منٹ کا وقفہ کیا۔ ورنہ مسلسل پانچ سو میل تک ریاض صاحب نے کار چلائی۔ رات کے دو بج گئے اور نیویارک ابھی بہت دور تھا۔ ان کو ہلکی سی نیند آنے لگی تو فرمائش ہوئی کہ گاؤ ورنہ میں اونگھ گیا تو حادثہ ہو جائے گا۔ مجھے تو آرام میں بھی نیند کم آتی ہے۔ اس غمگین حالت میں نیند کہاں آتی۔ چمگادڑ کی طرح چاق و چوبند بیٹھی تھی: تین گھنٹے متواتر گایا۔ ہر راگ، غزل، گیت جو یاد تھے۔ سنا دیئے تاکہ میاں صاحب کی آنکھ نہ لگ جائے اور ہم بے جنگ شہید نہ ہو جائیں۔ ایک ننھی سی زندگی کے لیے کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔ پانچ بجے تڑکے نیویارک پہنچے۔ اسی اثنا میں "بی بی سی" نے لندن کے ہندوستانی ہائی کمشنر کے دام میں پھنس کر سرکاری خبر سنا دی کہ لاہور نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اگر میرا دیور مجھے یقین نہ دلاتا کہ یہ قابل اعتماد خبر نہیں ہے اور ہم اپنے تار کا انتظار کر رہے ہیں تو میں شاید بیہوش ہو جاتی۔ دماغ سوچ سوچ کر سُن ہو چکا تھا۔ سب سیر اور کھایا پیا نکل گیا۔ بچیوں ہم نے وہیں چچا اور دادی کے پاس چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ جوان لڑکیاں جنگ میں کہاں لے جائیں۔ میں نے اس دن ذرا آرام کر کے بچیوں

کو "میٹروپولیٹن میوزیم" کی چیدہ چیدہ چیزیں جلدی سے دکھائیں. کیونکہ مجھے یقین تھا کہ میرے پیچھے یہ سب جگہ جائیں گی. مگر عجائب گھر نہیں جائیں گی. شکر ہے کہ یہ بہت محظوظ ہوئیں. واقعہ ہے اس عجائب گھر میں یونان کے باہر یونانی. پیرد کے باہر پیر دین. جاپان کے باہر جاپانی اور مصر کے باہر مصری خزانوں کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے۔ البتہ وہاں اپنے مغلیہ عہد کے نادر نمونے دیکھ کر دل میں ٹیسیں اٹھیں، بابر کی مرصّع تلوار عہد اکبری کے زیورات، جہانگیر کا جام زبرجد. اس انگوڈی پتھر کو تراش کر کیریاں اور گلاب بنائے ہوئے تھے جن میں مئے ناب ڈال کر یہ بادشاہ اپنی شام کی عبادت شروع کرتا تھا. اسی عہد کا ایک ریشمی قالین جس کے ایک انچ مربع میں ۲۲۵۰ پھندنے! ایک قالین پر اوندھے سیدھے انسان جانوروں میں لپٹے ہوئے اور جانور خود اوٹ پٹانگ بنے ہوئے تھے. گویا سولھویں صدی کا مغلیہ عہد آج کے پکاسو کی پیش روی کر رہا ہے یا حسرت یا نصیب! ہمارے عجائب گھر خالی پڑے ہیں اور ہمارے خزانے بیرونی ممالک میں سجے ہوئے ہیں.

تیسرے پہر میں نے کچھ ضروری تحفے خریدنے کے لیے بازار کا رُخ کیا نیو یارک کی دکانیں سجاوٹ اور فراوانی میں اپنی مثال آپ ہیں. دنیا کا سب سے سستا کپڑا یہاں سے لے لو۔

بہر حال مجھے اس وقت جلدی تھی میں تحفے لینے مصنوعی زیورات کی دکان میں گھس گئی. گھستے ہی چالاک دکاندار کہنے لگا "آپ نے سُنا. پاکستانی ہوا بازوں نے دلی کی پارلیمنٹ پر حملہ کر دیا اور شاستری وہیں ہلاک ہوگیا" مجھے جو ہول آیا تو فوراً واپس باہر آئی. کار کا ریڈیو لگایا. مگر ایسی کوئی خبر نہ تھی. اس دکاندار نے جھوٹ کیوں بولا. پھر عقل میں آیا کہ اس یہودی کی اولاد کو بیوپار کرتے کرتے اتنی تمیز ہو گئی کہ عموماً سرخ بندی والی ہندو اور غیر بندی والی مسلمان عورت ہوتی ہے. اس نے

مجھے دیکھتے ہی خوش کرنے کی کوشش کی۔ اس کا خیال تھا کہ میں شاستری کی موت کی خبر سن کر ناچوں گی اور خوب زیورات خرید دوں گی۔ یہاں الٹا ہی اثر ہوا۔ چاہے کتنی ہی خصومت کیوں نہ ہو۔ ہم ایک دوسرے کے لیڈروں کے مرنے پر کیسے خوش ہو سکتے ہیں۔ کوئی میں جن سنگھی تو تھی نہیں کہ گاندھی کے مرنے پر لڈو بانٹتی۔ لیکن یہ امریکی یہودی ایشیا کی آگ میں اپنے ہاتھ سینکنا چاہتا ہے۔ کوئی مرے اس کا سودا بکنا چاہیئے۔

دماغ اتنا ماؤف ہو چکا تھا کہ یہ بھی یاد نہ رہا کہ نیو یارک میں عالمی میلہ WORLD FAIR چل رہا ہے جس کے دیکھنے کا مجھے ڈیڑھ سال سے ارمان تھا۔ میں نے ریاض صاحب سے کہا کہ "آپ کو جلدی ہے آپ جائیے میں تین دن بعد آؤں گی۔ ورنہ ارمان رہ جائے گا کہ اتنی دور اتنا پیسہ خرچ کر کے آئی اور ورلڈ فیر بھی نہ دیکھا۔ یہ مان گئے۔

"نیویارک کا عالمی میلہ"

امریکہ اشتہار بازی میں تو ماہر ہے اور دوسرے ممالک کو بھی اس ہنگامی مشغلے پر مدعو کرتا ہے۔ بین الاقوامی میلہ دو سال کے لیے لگایا گیا۔ جس کے اکلوتے کارکن و بانی صفت مدگی تھے۔ MR MOSES ان حضرت سے اتنا بڑا درد سر سنبھالا نہیں گیا۔ کئی چیزوں میں اندھیر مچا ہوا تھا۔ لیکن ہاتھی مر کے بھی سوا لاکھ کا۔ میں نے یہ عالمی میلہ اپنے اختتامی موسم میں ۱۵ ستمبر کو دیکھا۔ جبکہ بیرونی سیاح کروڑوں کی تعداد میں دو سال پہلے دیکھ چکے تھے اس کو ہماری زبان میں "میلہ" کتنا ظلم ہے۔ ہمارے بیساکھی اور چراغاں کے میلے کہاں اور کہاں یہ؟ ایک الگ دنیا آباد تھی۔ جس تک پہنچنے کے لیے ٹرین سے دو گھنٹے۔ کار سے تین گھنٹے اور ہیلی کوپٹر سے آدھا گھنٹہ لگتا تھا۔ عجیب پر فضا مصنوعی اشتہاری شہر لگایا گیا تھا یہاں ۶۵ ممالک کے شاندار پرچم ان کی عمارات پر لہرا رہے تھے۔ سب کا ذکر بیکار ہے صرف چھ قابل تحسین تھے۔ جن میں سے دو حسین ترین مسلمان ممالک اردن اور انڈونیشیا کے تھے۔ یہ دلچسپ معرکہ تھا کہ یہودیوں کے گڑھ میں دو اسلامی ممالک نے بین الاقوامی اشتہار

بازی میں اول نمبر پائے لیکن حسب معمول بلکہ حسب امید انڈونیشیا کی صفت موسی سے آتے ہی جنگ ہوگئی۔ اس لیے اس کے وجیہہ "پویلین" PAVILION پر جو بالی مندر کی طرح بنا ہوا تھا تالے پڑ گئے۔ ہم صرف اس کے ظاہری نکھار اور جاوا کے مجسموں کو سراہ سکے جو اس کے باغوں میں ایستادہ تھے۔

جورڈن نے اپنی عمارت کی بیرونی چھت پر ریت کے ٹیلوں کی طرح اونچے نیچے گنبد بنائے تھے جو دھوپ میں ریت کی طرح چمکتے اور رات کو فانوس معلوم ہوتے تھے۔ اندر سے طرز زیبائش اور بھی شائستہ اس ملک کی مصنوعات قابل دید۔ اس کے فلم، اس کے شیش کباب سب بے حد مزیدار تھے۔ جب باہر نکلنے لگے تو دروازے پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا "ذرا توقف کریں" اور پھر انسان کے ضمیر سے استدعا تھی۔ عرب مہاجرین کے لیے پڑھ کر میں بے ساختہ رو دی۔ مظلوم کی آہ میں کتنا اثر کتنا خلوص ہوتا ہے۔ سنا ہے یہودیوں نے اس کندہ درخواست پر بہت احتجاج کیا۔ لیکن قانونی طور پر "پویلین" کے اندر پوری آزادی تھی۔ اگر یہ آزادی نہ ہوتی تو سپین کے سہ طرفہ پرجمال "پویلین" میں "سلیوڈر ڈالی SALVADORDALI کا زبردست "میورل" MURAL کیسے ہوتا۔ جس کی سرخی تھی "ڈالر کی فتح" اور اس فتح کا نتیجہ کینوس پر دکھایا گیا تھا کہ انسانیت کرب میں مبتلا ہے۔ بھوکے ننگے بچے مزدوروں کے شکستہ اعضاء بھیڑیئے اور آدمی کی متشابہ اشکال۔

سپین نے ناچ رنگ میں سب کو مات کر دیا۔ صبح شام لوک گیتوں اور ناچوں کی مفت نمائش۔ سیاہ اور سرخ لباسوں میں پری چہرہ دوشیزائیں اور دمکتے ہوئے جوان گھنٹوں ٹھٹ کے ٹھٹ لگے رہتے تھے اور دل نہیں بھرتا تھا۔ ہسپانوی موسیقی میں ویسے بھی سحر انگیز جاذبیت ہے۔ پھر ان کا خانہ بدوش رقص "جو سیول" "SAVILLE" کی مورنی "میںوا ایلا" ہر شام اپنے مخصوص لباس میں دکھاتی تھی۔

بلجیم نے اپنا اصلی روایتی گاؤں کا گاؤں آباد کیا ہوا تھا۔ جہاں اس کے ہیرے

جواہرات اور صنعتی ہنر کا مظاہرہ ہوتا تھا. ہندوستان کا "پویلین" قابل ستائش تھا اور پھر کیوں نہ ہوتا اندرا گاندھی نے دو سال قبل اس کی تیاری کے لیے کمیٹی بٹھائی ہوئی تھی اور خود پہلے جاکر دو دفعہ معائنہ کر چکی تھی محنت کا پھل ہر ایک کو ملنا چاہیے. ہندوستان نے نمائش تین منزلوں میں پھیلائی تھی. پہلی پر "ماضی" دوسری پر "حال" اور تیسری پر "مستقبل" کے لیبل لگے تھے. ماضی میں تاریخی ورثہ دکھایا تھا. ہم عصر دور کی ٹیکسٹائل اور فولادی مشینیں آزادی کا ڈرامہ اور ہندوستان کی مایہ ناز دستکاریاں، تیسرا تختہ "آئندہ" تو خیر ایک قیاس آرائی تھی جو پوری بھی ہو سکتی ہے. بشرطیکہ ہندوستان غذائی اور صوبائی مسائل حل کرے.

ہندوستان کے پویلین میں ایک مہذب عورت مل گئی. جس نے ہمیں سب اشیاء سلیقے سے دکھائیں. اسی شام چین نے ہندوستان کو الٹی میٹم دیا تھا. اور جب جنگ کا ذکر چھڑا تو عورت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے. بولی "پاکستانی ہندوستانی تو بالکل ایک جیسے ہیں. اگر چینی آ گئے تو ان کو معلوم کیسے ہو گا کہ کون ہندو ہے کون مسلمان"۔ میں نے کہا۔ "اگر ہندوستان نے پہلے ہی یہ گر سمجھ لیا ہوتا تو پاکستان بنتا ہی کیوں. پاکستان ہندو کی تفرقہ پردازی کا اعلانیہ ثبوت ہے"!

اس کے بعد پاکستان کے "پویلین کا ذکر ہی نہ کروں تو بہتر ہے جو وہاں تھا. اس کی اُمید پہلے سے تھی. کیونکہ صرف چار مہینے پہلے بھگدڑ میں ایک کمیٹی بنائی گئی. مجھے مدعو کیا گیا کہ اپنی رائے دوں میں نے پہلا سوال کمیٹی کے چیئرمین سے کیا : "کہ آپ اس پویلین پر کتنا خرچ کرنا چاہتے ہیں"۔ انھوں نے بتایا "سوا دو لاکھ. جس میں سے دو لاکھ وہیں نیو یارک میں پویلین کی آرائش و تیاری میں خرچ ہو گا اور باقی ۲۵ ہزار ہم نے جہاز میں سامان کے لیے وقف کر دیا ہے"۔ میں نے وہیں دعائے مغفرت پڑھ کر اپنی مصروفیات کی بنا پر معافی و رخصت چاہی۔

عالمی میلے میں اپنا سٹال دیکھ کر بے بسی سے رونا آ گیا. اگر ہمارے پاس کچھ قابل نمائش

ورنہ نہ ہوتا تو شاید صبر آجاتا۔ لیکن اب کیسے صبر آئے۔ جب ہم نے جان توڑ کر سختیاں جھیل کر پچھلے پانچ سال میں ایک پندار سا پیدا کیا۔ ایک فخر سا حاصل کیا۔ اس دستی میراث میں جسے لوگ بھولتے جا رہے تھے۔ صرف میرے چھوٹے سے مرکز نے سارے ہندوستان اور پاکستان میں پہلی دفعہ موہنجوڈارو اور ٹیکسلا کے ۳۳ نمونے جو بہت مقبول ہوئے چاندی، تانبے، پیتل میں بنائے تھے۔ بدھ سٹوپا کے حسین لیمپ جن کو ایک "سینئر" بیگم نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ نمائش میں نہیں جا سکتے یہ ہندو ہیں" سب سے زیادہ محبوب ہوتے۔ اول تو یہ "سٹوپا" ہندو نہیں اور بالفرضِ محال اگر ہیں بھی تو ہم اپنی تاریخ سے کیسے گریز کر سکتے ہیں؟

بحث ہمیشہ فضول ہوتی ہے اور میں تہی دماغ ظلمت پسندی کے سامنے ہمیشہ گردن جھکا دیتی ہوں، نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ پاکستانی پویلین کی عمارت کا اسلامی تاریخ و معاشرے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ کسی بدنما چاردیواری پہ سبز گنبد اٹکانے سے عمارت اسلامی معاشرے کی نمائندگی نہیں کر سکتی۔ پھر جس امریکن ماہر نے یہ عمارت ترتیب دی اس نے ضرور پیسے کھائے اور کھلائے۔ نمائشی الماریاں اس طرز پر بنائی تھیں کہ ان کا صاف ہونا محال تھا۔ مٹی کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ اندر دس پیاری پیاری جوان لڑکیاں بنی سجی کھڑی تھیں۔ ان گڑیوں کی ٹریننگ اور تنخواہوں کرایوں پہ ایک لاکھ خرچ کیا گیا تھا۔ لیکن ان کا فائدہ؟ یہ عالمی میلہ پاکستان کے نسوانی حسن کی نمائش تو تھی نہیں وہ بیچتیں کیا؟

سوائے گل جی کے مرمریں میورل کے جو قابل ذکر تھا۔ وہاں مٹی سے لدے قالین (جو چیزیں صاف ہو سکتی تھیں وہ بھی نہیں کی گئیں) کانچ کی چوڑیاں، بوسیدہ ساڑھیاں اور ملتان کے اونٹ کی کھال کے وہ لیمپ جو اپنے ملک میں بھی نہیں بکتے، سجے ہوئے تھے۔ باقی ماندہ سامان بندرگاہ کے گوداموں میں پڑا تھا۔ کمیٹی کے پاس پیسہ ختم ہو گیا تھا کہ اُس کو چھڑائے۔ باہر ہوٹل فاروق کے تکے بک رہے تھے وہ بھی بدمزا! کوا چلا ہنس کی چال، اپنی بھی بھولا۔ جو سالوں پر سفید قومیں مرتی ہیں، یہاں سرے سے غائب تھے۔ اگر انہیں پھیکے

ٹکے کھانے تھے تو اپنے "ردسٹ" ہی کیوں نہ چباتے ؟

نیز خود امریکہ نے اس نمائش میں جو اپنی صنعتی اور ٹیکنولوجیکل ترقی کا مظاہرہ کیا۔ اس کی کون ٹکر لے سکتا تھا ؟ سٹینڈرڈ جرسی سے لے کر جنرل موٹر تک وہ دس عظیم کارپوریشنز جو دنیا کی منڈیوں پر چھائی ہوئی ہیں وہ یہاں جلوہ گر تھیں۔

لیکن مجھے تو سب سے زیادہ لطف "بل گرام" مبلغ کے اشتہاروں میں آیا۔ یہ "ایونجیکل" پیامبر بھی اپنی دکان لگائے "نزدان" کی پرچون کر رہا تھا۔ ایک دن یہ "نکتی" سوپر مارکیٹ میں دس فی صد کٹوتی پر بک رہی ہوگی۔

ایک شام میں بچوں کو "یو۔ این" دکھانے لے گئی۔ دکھاتے دکھاتے خود ہانپ گئی ہر شاندار ہال ایک خوشحال ملک کا تحفہ تھا۔ جتنی "یو۔ این" کی سجاوٹ موثر ہے۔ اگر اس کی سیاست بھی ایسی ہو جاتی تو کئی ملکی قسمتیں سنور جاتیں۔ اس عالمی ادارے پر ایک مصرعے کا مرثیہ کہا جا سکتا ہے۔ ع

نشستند و گفتند و برخاستند

اس کی مشاورتی مجالس کریں بھی کیا ؟ جب تک "کونگو" CONGO پر ڈرافٹ تیار ہوتا ہے، پیچھے کونگو کا نقشہ بدل جاتا ہے۔ ہر جرنیل ایک نئے رنگ کا مربی ڈھونڈھ لیتا ہے۔ کوئی سرخ، کوئی پیلا، کوئی سفید، کوئی کالا۔

ابھی عرصہ دراز تک "افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ پانچ بڑی طاقتوں کی شطرنج میں محض پیادوں کی طرح استعمال ہوں گے۔

یہ یو۔ این۔ او" تو بالکل ڈھکوسلہ بن کر رہ گیا ہے۔ اسے امریکی خارجی پالیسی کا دایاں بازو کہا جائے تو بہتر ہو گا۔ عمل کے وقت اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ انصاف کے وقت آواز بیٹھ جاتی ہے۔ مجھے تو اس کی زیست کا صرف ایک جواز ملتا ہے اور وہ یہ کہ کمزور قوموں کی ناک رکھنے کے لیے یہ اچھا بہانہ بن سکتا ہے۔ جب غریب پٹنے لگے تو

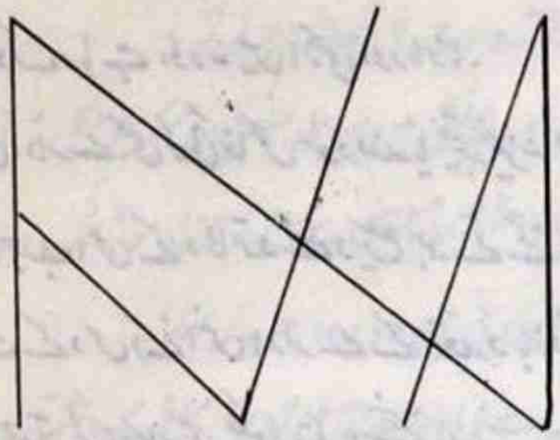
یہی کہتا ہے کہ کو توال رک رہا ہے، ورنہ میں ابھی اور مارتا۔

اس کے غیر سیاسی ادارے بھی کوئی خاص سود مند یا نتیجہ خیز نہ بن سکے۔ وجہ وہی پرانی! "پارکن سن قانون" کے بموجب اس کے دفاتر و عملے وسیع ہوتے گئے۔ غیر ملکی امداد محدود ہوتی گئی۔ بین الاقوامی خیرات کے دس آنے اس ادارے کے متعدد بازوؤں کی شان و شوکت پہ خرچ ہوتے ہیں اور چھ آنے بھکاری ملکوں تک پہنچتے ہیں۔

ہر سال اس ادارے کے دبیز قالینوں پر چل کر اس کے مہنگے ریستوران میں ہزار اقسام کھا کر انسان کو ایشیا کے قحط فراموش کر دینے چاہئیں۔ اس مہذب سفیری فضا میں ہر ایک دوسرے کو YOUR EXCELLENCY کہتا پھرتا ہے۔ ہم بھی کچھ دیر دیر کو اپنے آپ کو "مائی ایکسی لینسی" سمجھنے لگے اور اس حقیقت کو بالکل فراموش کر دیا کہ اس وقت ہم عالمی امن کی آخری نیم کشتہ امید اور بین الاقوامی انصاف کے موروثی مدفن میں بیٹھے ہیں۔

امریکہ کے ایک رئیس ترین خاندان کے ایک فرد "مسز ونڈر بلٹ ویب" VANDER BILTWEBB نے دو سال ہوئے دستکاروں کی ایک عالمی کونسل بنائی۔ جس میں پچپن ممالک نے نمائندگی حاصل کی اور ان کو اپنا صدر چنا۔ یہ خاتون جب پاکستان میں دستکاریاں دیکھنے آئیں تو مجھ سے ملیں اور میں نے "پاکستان ٹائمز" کے لیے ان کا انٹرویو بھی لیا۔ یہ ستر سالہ لمبی، صحت مند بیوہ ہیں جو عیسائی مشنری زیادہ معلوم ہوتی ہیں اور امریکی امیرزادی کم انہوں نے مجھے نیویارک میں لنچ پہ بلایا اور "ہاؤس آف امریکہ" دکھایا۔ ان کی سرپرستی میں یہ ایک کامیاب ادارہ ہے۔ یہاں ہنرمند دستکار کو ہر قسم کی مدد اور نئے نئے مارکیٹ بہم پہنچائے جاتے ہیں۔ اس کی دو منزلوں پہ ہر دستی ہنر میں تجریدی جدت پیدا کی گئی ہے۔ لیکن جدت نے ضرورت اور افادیت کو طلاق نہیں دی۔

اس سفرنامے میں ہمارے دورے کا نقشہ بنائیے تو یوں ہوگا:



تین دفعہ امریکہ میں داخل ہوئے نکلے۔ اس در آمد بر آمد میں امریکہ کا ہر دفعہ ایک نیا رُخ دیکھا۔ امریکہ کے بھی شِو مہاراج کی طرح کئی رخ ہیں۔ کئی روح پرور اور روح فرسا رخ۔ ایک مخلص مبلغ کا جو دنیا کو اخلاقی اصولوں کی تلقین کرتا ہے۔ ایک بی جمالو کا جو ممالک کو خود اسلحہ بارود بیچ کر بین الاقوامی مجلس میں تماشہ دیکھے۔ ایک دیالوان داتا کا جو سارے جگ کو دان دیتا ہے۔ ایک یہودی بنئے کا جو دنیا کی ساٹھ فیصد منڈیوں پر قبضہ کئے ہوئے ہے۔ جتنا دنیا کو" اعانت کے نام پہ دیتا ہے۔ اس سے زیادہ تجارت کے ذریعے واپس لے لیتا ہے۔ دینے والا بھی خوش لینے والا بھی خوش!

یہ امریکہ کسی زمانے میں ایشیا اور یورپ کی لبرل تحریک کے لیے ایک مشعل راہ ہوتا تھا۔ اس کی جمہوریت کے لبرل آئین اور اس کی امن پسندی صدر روز ویلٹ" تک مختلف انٹلیکچول طبقات کے لیے ایک منتہائے نظر تھی۔ سنگ مرمر میں صدر لنکن کے کندہ اقوال آج بھی جسم میں حرارت پیدا کر دیتے ہیں۔ پھر اس ملک کی اندرونی اور بیرونی سیاست و اقدار میں بتدریج کمزوری کیوں اور کیسے آئی؟ یہ جمہوریت کا علمبردار آج لاطینی امریکہ، افریقہ اور ایشیا میں کیوں سُست پڑ گیا اور نہ صرف سست پڑ گیا بلکہ کئی ہر دلعزیز جمہوری حکومتوں کو اُلٹتا دیکھ کر شاداں اور فرحاں ہوا۔

جس امریکہ سے ہم حق تلفی منسوب نہیں کرتے تھے۔ آج وہ انصاف کی دوڑ میں پیچھے

پیچھے ہے۔ جس ملک نے جنگ عظیم کے بعد مارشل پلان کے ذریعے یورپ کو نئی اقتصادی زندگی بخشی۔ آج اسی ملک نے کرۂ ارض کے گرد تین ہزار نیوکلیر اڈے جماکر اقوام کی آزادی اور تحفظ کو مضحکہ خیز بنادیا ہے۔

دنیا کا سب سے بڑا ملک جس کی نوّے فی صد دولت صرف دس فیصد ہاتھوں میں ہے، یہ ملک اپنی جنوبی اور وسطی غربت کو نہیں سنبھال سکتا۔ لیکن ویت نام کے قتل و غارت پر کروڑوں ڈالر ضائع کر سکتا ہے۔ یہ انسان کو چاند پر پہنچانے کے لیے راتوں رات کئی ارب کا بجٹ منظور کر لیتا ہے۔ لیکن اپنی سرزمین کے چوہوں کو مارنے کی توفیق نہیں جو نیگرو بچوں کا نرم نرم گوشت کتر لیتے ہیں۔ یہ علوم و فنون کا فیاض مربّی، عالمی تھیٹر تیج کا اکھاڑہ۔ جہاں کے محض ایک عجائب خانے کا بجٹ کراچی میونسپل کارپوریشن کے بجٹ سے تگنا ہے۔ جہاں فن معماری پر اتنا خرچ کیا جاتا ہے جتنا ایشیا کی بھوک پر۔ جہاں ہنر کی اتنی قدر بلکہ پرستش ہو کہ دنیا جہاں کا ہنر سمٹ کر وہاں آن بسے۔ ٹیکنالوجی اور سائنس میں اسی قوم نے وہ زقند لگائی ہے کہ آسمان پر تھگلی جمادی۔ کئی مضامین میں اس کے معیار دنیا میں سب سے اعلیٰ، مشرقی ساحل کی یونیورسٹیاں لبرل افکار کی مرجع و ماوی، ان علمی فضاؤں میں مکمل آزادیٔ فکر، آزادیٔ اظہار۔ مخصوص علاقوں کی صحافت بالکل نڈر اور بے لگام۔ اس کے عوام کو کھلی چھٹی۔ جو چاہیں بولیں۔ جو چاہیں کریں (البتہ نیگرو کے لیے قوانین جدا ہیں)

اس کے باوجود سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا وجہ ہے کہ امریکہ کا ہر لبرل صدر یا صدارت کا لبرل امیدوار قتل ہو جاتا ہے وہ کیا پوشیدہ طاقت ہے جو ایک خاص مقام پر پہنچ کر لبرل ازم کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔

صدر آئزن ہاور کی آخری الوداعیہ تقریر کانگریس کے سامنے یادگار رہے گی جس میں انہوں نے امریکی معاشرے کو "ملٹری انڈسٹریل کومپلیکس" MILITARY

INDUSTRIAL COMPLEX کے خلاف متنبہ کیا تھا۔ یہاں اونچے پائے کی تجارت فوج پر چھائی ہوئی ہے۔ ہر قسم کا دباؤ ڈال کر سودے بازی کرتی ہے اور پھر یہ فوج یعنی "پینٹگن" امریکی صدر پر چھا جاتی ہے۔ اس ملک کی جمہوریت پر طرح طرح کے دباؤ ڈالے جاتے ہیں۔ ان "پریشر گروپس" کی ایک چھوٹی سی مثال اس طرح ملتی ہے کہ پینتیس سال تک امریکہ ایک معصوم اصلاحی آئین MEDICARE اپنے معمّر مفلس مریضوں کے لیے پاس نہ کر سکا۔ کیوں کہ امریکی میڈیکل ایسوسی ایشن ہر دفعہ کانگریس کے ممبران اور پریس کو لاکھوں ڈالر کی رشوت دے دیتی تھی۔

امریکن سوسائٹی کسی بھی فلاحی اصلاح پر ٹھٹھک جاتی ہے۔ فلاح و بہبود انفرادی طور پر بہت ہوتا ہے۔ جتنی خیرات یہاں بٹتی ہے شاید کم ہی اور جگہ بٹتی ہو۔ مگر سرکاری فلاح و بہبود کے ذکر پر بھی قوم کے ایک خاص طبقے کے کان فوراً کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس "فری اینٹرپرائز" معاشرے میں میں انفرادی سعی پر اس حد تک زور دیا گیا ہے کہ حکومت اگر کوئی فلاحی قدم اٹھائے تو اس پر "سرخ اشتراکیت" کا الزام نہیں تو "گلابی سوشل ازم" کی تہمت ضرور لگ جاتی ہے۔

تو صاحب اس ملک کی تجلیاں اور تاریکیاں کہاں تک بیان کریں اور ملکوں میں بھی ہزاروں تضاد ہیں۔ ہمارے اپنے معاشرے کے ظاہر اور باطن میں کتنا فرق ہے ہمارے یہاں سیاست رسوا، سرکاری نظام رسوا۔ مذہب کے نام پر کیا کیا، بیسیی سازشیں ہوئی ہیں۔ نہ انفرادی اخلاق نہ سماجی اخلاق۔ نہ اقتصادی یا بیوپاری ایمانداری ہم کسی کو کیا کہہ سکتے ہیں۔ اپنے گریبان میں پہلے منہ ڈالیں۔ ہماری جڑیں تو کھائی گئیں۔ اب نیا عہد نئے بیج بوئے گا تو شاید اچھی فصل اُگے۔ اور ہماری طرح اکثر مشرق کے غریب ممالک کا برا حال ہے۔ ان مشرقی ممالک کی بدعملیوں کو معاف تو نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ان ممالک کے اقتصادی اور سماجی حالات جرائم کی سنگینی کو کم ضرور کر دیتے ہیں۔ لیکن دنیا کے سب

سے امیر ملک کو کیسے معاف کریں جس میں ہر طبقے پر مخمل میں ڈھکی چھپی اور نفاست میں
پروئی ہوئی رشوت چلتی ہو، بلیک میل، تو ایک طرف ہم غریبوں کے ملک میں جرائم
عموماً "زر، زمین، زن" کے چکر میں ہوتے ہیں۔ امریکی معاشرے میں کئی دفعہ دیکھا کہ
"جرم برائے جرم" بلکہ "جرم برائے لذت" ہوتا ہے۔ ان جرائم کی نوعیت اور فہرست
روزانہ اخباروں اور رسالوں کے کالم کی سرخیاں بنتی ہیں۔ پریس ٹیلی وژن اور ہالی وڈ کی
فلموں نے جوانوں کو اتنا سنسنی خیز اور سنسنی پسند بنا دیا ہے کہ جو کچھ وہ پردہ سیمیں
پر دیکھتے ہیں۔ اس کو اپنی روزمرہ زندگی میں بھی ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

ماہرین نفسیات، والدین اور پادری سب پریشان ہیں کہ نوجوان نسل کے اخلاقی و
روحانی بحران کو کیسے روکیں۔ اس کی وجوہ کہاں تلاش کریں۔ خاندانی میراث میں؟
مادری تربیت میں؟ سکول کالج میں؟ کلب میں؟ سماجی ماحول میں؟ یا بارود کے اس کھلے
بیوپار میں جس پر حکومت نے کوئی پابندی نہیں لگائی۔ دنیا میں سب سے زیادہ ہتھیار اور
بارود امریکہ کے اندر استعمال ہوتا ہے۔ بلکہ تحفتہً ڈاکخانے کے پارسلوں میں بھیجا جاتا ہے۔
کرسمس یا بڑے دن پر آپ اپنی محبوبہ کو پھولوں کے ساتھ ایک ننھی سی پستول بھی بھیج
سکتے ہیں۔

بھلا ہو امریکہ کی معدنی اور زرعی زرخیزی کا۔ ایک ہی نسل میں انہوں نے اتنا مال
جمع کر لیا کہ آئندہ نسلیں اس کو دگنا تگنا کرتی گئیں۔ مایا کو مایا ملے کر کر لمبے ہاتھ۔ لیکن
جتنی مایا بڑھتی گئی اخلاقی کایا پلٹتی گئی۔ اب یہ خوش نصیب ملک جس کو خدا نے ہر
نعمت سے فیضیاب کیا کئی سماجی روگوں میں گرفتار ہے۔ اٹلی میں بھی مافیا ہے لیکن
یہاں جرم کو سیاسی جتھا اور ٹریڈ یونین نہیں بنایا گیا۔ لوگ پہلے صرف جنوب یا شکاگو
کو روتے اور بدنام کرتے تھے۔ اب منظم غنڈہ گردی امریکہ کے ہر بڑے شہر میں
ہو رہی ہے۔ اب واشنگٹن جیسے شریف النسل شہر میں جھٹپٹے کے بعد بعض علاقوں

میں نکلنا مشکل ہے۔

امریکہ نے ڈاکٹر فاؤسٹ جیسا سودا کیا ہے۔ جلوۂ حُسن کے بدلے اپنی روح کو فروخت کر دیا۔ مذہب کو لپیٹ کر چھتری کی طرح کونے میں رکھ دیا گیا ہے۔ جسے صرف اتوار کو کھولا جاتا ہے۔ اس کی جگہ عام طور پر ایک نیا مذہب آگیا ہے "لچھمی دیوی کی پوجا" پیسہ بناؤ جلدی جلدی۔ کسی طرح۔ کسی ذریعہ سے بھی ہو بنا دُ ریمی اقدار اب مشرق میں بھی سرایت کر رہی ہے، انفرادی ضمیر کی جگہ اجتماعی اخلاقیات آگئی ہیں۔ جرائم اس لیے نہیں ہوتے کہ ہمسائے کے ساتھ رہنا مشکل ہو جائے گا۔ پھر نیم پختہ علم نفسیات نے اور بھی ستیاناس کر دیا۔ یہ جرم کی وجہ لاشعوری ذہن کے پس منظر میں ڈھونڈھ کر مجرم کو بجائے جیل خانے کے پاگل خانے بھیج دیتے ہیں۔ پھر یہ خیال بھی ہر دلعزیز ہوتا جا رہا ہے کہ وہ جرم جرم بھی نہیں جس سے کسی کو نقصان نہ پہنچے۔

خدا آئن سٹائن کو بخشے جس کے اضافیت کے نظریے نے اخلاقیات کو بھی اسی طرح متاثر کیا ہے کہ زندگی کی ہر قدر اضافی ہوگئی ہے۔ اور مستقل انسانی قدریں عنقا ہوتی جا رہی ہیں۔

یہ نوع انسانی کی تاریخ میں پہلی قوم ہے جس کا بنیادی مسئلہ دولت کی کمی نہیں بلکہ افراط زر ہے "میڈیسن ایونیو" میں اقتصادیات کے ماہرین کی ایک فوج کی فوج بیٹھی صرف دن رات یہ سوچ رہی ہے کہ معاشرے میں نئی سے نئی مانگ کیسے پیدا کریں۔ اُکسا اُکسا کر۔ بھکا بھکا کر۔ ورغلا ورغلا کر عوام کو کس طرح چیزیں خریدنے پر رام کیا جائے کہ ٹوتھ پیسٹ کی ایک سو چار اقسام کے باوجود ایک سو پانچویں قسم بہترین ہے۔ زیادہ خرچ زیادہ مانگ اور زیادہ پیداوار کا ایک چکر چل رہا ہے۔

خدا کا یہ کہنا کہ "ہم تمہیں مال و دولت سے آزماتے ہیں" یہاں پورا ہوا ہے۔ اتنا ملا کہ یہ قوم دینے والے کو بھول گئی۔ اب صرف اس کا امیر طبقہ ہی فرصت کا مالک نہیں بلکہ

متوسط طبقہ بھی کم سے کم اوقات محنت اور زیادہ سے زیادہ لمحات فرصت حاصل کرتا جار ہا ہے۔ اب ماہرین کے لیے دوسرا مسئلہ درپیش ہے کہ قوم کو فرصت کا صحیح استعمال کیسے سکھائیں۔ کچھ مفکروں کا خیال ہے کہ امریکی قوم اخلاقی طور پر منتشر ہو رہی ہے۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ ہے بیزاری اور تجارتی تفریح سے ماڈرن دماغ جتنی مشینیں مزدوروں کی جگہ لیتی جا رہی ہیں۔ جتنی "خود کاری" ظہور پذیر ہو رہی ہے۔ ایک امریکی کی فارغ الوقتی اور فارغ البالی بہ الفاظ دیگر "بیزاری بڑھتی جا رہی ہے۔

قوم کی تفریح اور تعلیم کا منبع ٹیلی ویژن بن کر رہ گیا ہے اور اس کے معیار محض سوداگرانہ ہونے کی وجہ سے مہلک بن گئے ہیں (امریکہ اپنے بجٹ کا ڈیڑھ فی صد تعلیم پر خرچ کرتا ہے۔ اس کے برعکس غریب انگلستان تین فی صد اور روس ساڑھے سات فیصد)، ٹیلی ویژن اس بیکراں قوم سے بیک وقت خطاب کرنے کا ایک ہی ذریعہ رہ گیا ہے اور اس ذریعہ نے قوم کے ذہن کو نرم نرم حریرا پلا پلا کر اس کی استعداد کو مفلوج کر دیا ہے۔ "ایڈورڈ مرو" EDWARD MURROW آنجہانی جو ٹیلیویژن کا سب سے اعلیٰ صحافی اور ناشر تھا اور جس نے معاشرے کے مختلف پہلوؤں پر دلیرانہ روشنی ڈالی اور میکارتھی کی تنگ نظری اور سیاسی بغض کو پردہ سمیں پر کروڑوں آنکھوں کے سامنے بے نقاب کیا۔ خود اپنے محبوب ٹیلی ویژن کے بارے میں کہتا ہے۔

"کسی بھی ملک میں ٹیلی ویژن جیسا عوامی خطیب اس کے سماج کے سیاسی، معاشی اور ثقافتی مزاج کا صحیح عکاس بنتا ہے۔ ہم امریکی آج کل مالدار، موٹے، آرام دہ اور خوش ہو گئے ہیں اور ہم اپنی ہرادا پر خود فدا ہیں۔ ہم اپنی مادی تکمیل میں اتنے مگن ہیں کہ ہم میں ناخوشگوار معلومات دیکھنے کا رجحان ہی نہیں رہا۔ جب تک ہم یہ نہیں سمجھیں گے کہ ٹیلی ویژن کو عوام کو بہلانے، دھوکہ دینے اور حقیقت سے بچنے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ ہم نیم خفتہ کہلائیں گے اور شاید اسی وقت جاگیں گے جب بہت دیر ہو چکی ہو گی"۔

امریکہ کے "روکی فیلر، اور فورڈ" دنیا میں ضرب المثال بن گئے ہیں۔ اس ملک کے پیش رو خاندانوں نے نئی نئی دولت تو حاصل کرلی، مگر یورپ کی خاندانی قدامت نہ خرید سکے اس کے لیے انہوں نے اپنے گرد وہی حدود کھینچنا شروع کردیں جو فرانس انگلستان اور بقیہ یورپ کے اعلیٰ خاندان برقرار رکھتے ہیں۔ معیاری کھانے، معیاری پوشاک، معیاری محل معیاری مشاغل معیاری شادیاں و القاب بہت ضروری ہیں، معیاری فنون کی سرپرستیاں یہ امریکہ کے ساٹھ خاندان صحافت کی دنیا میں سرخیل بن گئے ہیں۔ آئے دن ان کی تصویریں نکلتی ہیں۔ یہ ہر وقت عوام کی رشک آمیز نظروں میں ہیں۔ اب جوں جوں پیسہ پھیلتا جارہا ہے ان کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ ایسا وقت بھی آئے گا کہ ہر محلے میں کروڑپتی ہوں گے۔ یہ ریل پیل کہاں جاکر رکے گی۔ کیا اس بہتی گنگا میں سب ہاتھ دھو سکتے ہیں؟ لیکن یہ سب صرف بالائی طبقات کے لیے روا ہے۔ باقی سب اس نعمت سے محروم، اس کی وجہ قدیم لاعلاج تعصب ہے۔ دنیا میں نسلی اور سماجی بغض کو کہیں اتنا منظم پلیٹ فارم نہیں نصیب ہوا۔ جیسا امریکہ میں، پہلے ہمیں بتایا جاتا تھا کہ یہ زہر صرف جنوب تک محدود ہے۔ جنوبی حصہ نہ صرف حبشیوں پر زیادتیاں کرتا ہے۔ بلکہ کسی "لبرل"، صحت مند اور آزاد عنصر کو پنپنے نہیں دیتا۔ یہ جاہلان جنوب جن کی اکثریت فوج میں بھرتی ہے۔ سماجی انصاف و مساوات کے خلاف ہیں جب تک کہ وہ ان کی موافقت میں نہ ہوں نتیجہ صفر! چنانچہ جنوب میں "کلو کلکس کلن" KU-KLUX KALAN جیسی مہلک تحریک پُراسرار پردوں میں شروع ہوئی اور مشرقی امریکہ میں "برتچ سوسائٹی" JOHAN BIRCH SOCIETY یہ دونوں سفید تحریکیں درپردہ کروڑوں روپے کے چندے پر اس لیے پل رہی ہیں کہ ان کا نوشتہ لائحہ عمل یہ ہے کہ "کسی غیر سفید کو سر مت اٹھانے دو۔ بلکہ ان سفید چیزوں کو بھی جو ہمارے معاشرے میں انتشار پیدا کرنا چاہتی ہیں۔" (اور انتشار سے مراد ہے، سماجی مساوات

نیگرو کو حقوق۔ جمہوریت امن پسندی کے لیے احتجاج۔ جرائم اور بے انصافی کا انسداد، یہ تحریکیں امریکہ کے بڑے بڑے تاجروں کے پیسے سے زندہ ہیں۔ امریکہ کا سرکاری نظام اس کے سامنے بالکل بے بس ہے۔ آزاد صحافت کہیں کہیں ان کے خلاف اپنی آواز بلند کرتی ہے۔ لیکن کون سنتا ہے۔ جنوب کے تو کئی منصف مزاج نامہ نگار اور مدیر اس تحریک کے پوشیدہ ہاتھوں سے قتل ہو گئے۔

امریکہ کے متعلق میرے تاثرات طول پکڑ گئے مگر اپنے برصغیر اور انگلستان کے بعد اگر کسی معاشرے کو قریب سے دیکھا تو اس کو۔ کیونکہ اس ملک سے امیدیں زیادہ تھیں اس لیے مایوسی بھی زیادہ ہوئی ہے۔ میری زندگی کے چند بہترین دوست اور سہیلیاں اس ملک کے ہیں۔ اس کے اکثر عوام نہایت گرم جوشی اور محبت والے ہیں۔ باہر والوں کی دل و جان سے خاطر بھی کرتے ہیں۔ راہ چلتے بھی ہنس کر بات کرتے ہیں۔ آگے بڑھ کر مدد کرتے ہیں۔ خوش مزاجی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اکثر سیاح اس ملک سے خوشگوار یادیں بھی لاتے ہیں۔ لیکن میری طرح بیشتر سیّاح ذاتی شخصیتوں اور ملکی لائحہ عمل کو ہم معنی نہیں سمجھتے۔ امریکی عوام کا بیشتر حصّہ نیک دل امن پسند ہے۔ لیکن اس ملک کی اندرونی اور خارجی پالیسی نے ایسا نظام پیدا کر رکھا ہے کہ عوام تک بہت سے حقائق نہیں پہنچتے اور ان کو ووٹ دیتے وقت تصویر کے دونوں رخ نہیں معلوم ہوتے۔ امریکی اخبارات اپنے اندرونی حالات شائع کرنے میں آزادی رکھتے ہیں۔ مگر خارجی پالیسی کے لیے سرمایہ داری کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اور اس سے بدتر حالت ٹیلی ویژن کی ہے جہاں عوام کو بین الاقوامی حقیقتوں تک پہنچنے کی اجازت نہیں۔

امریکہ کا سیاسی نظام اور الیکشن کا گورکھ دھندا اس قدر پیچیدہ اور پُراسرار ہے کہ باہر کے لوگوں کی سمجھ سے باہر ہے۔ اس کے علاوہ ایک طبقہ جو نہ ری پبلکن کے ساتھ ہے نہ ڈیموکریٹ کے ساتھ ہے۔ بالکل بے آواز اور بے آسرا ہے۔ اسی الیکشن کے گورکھ دھندے

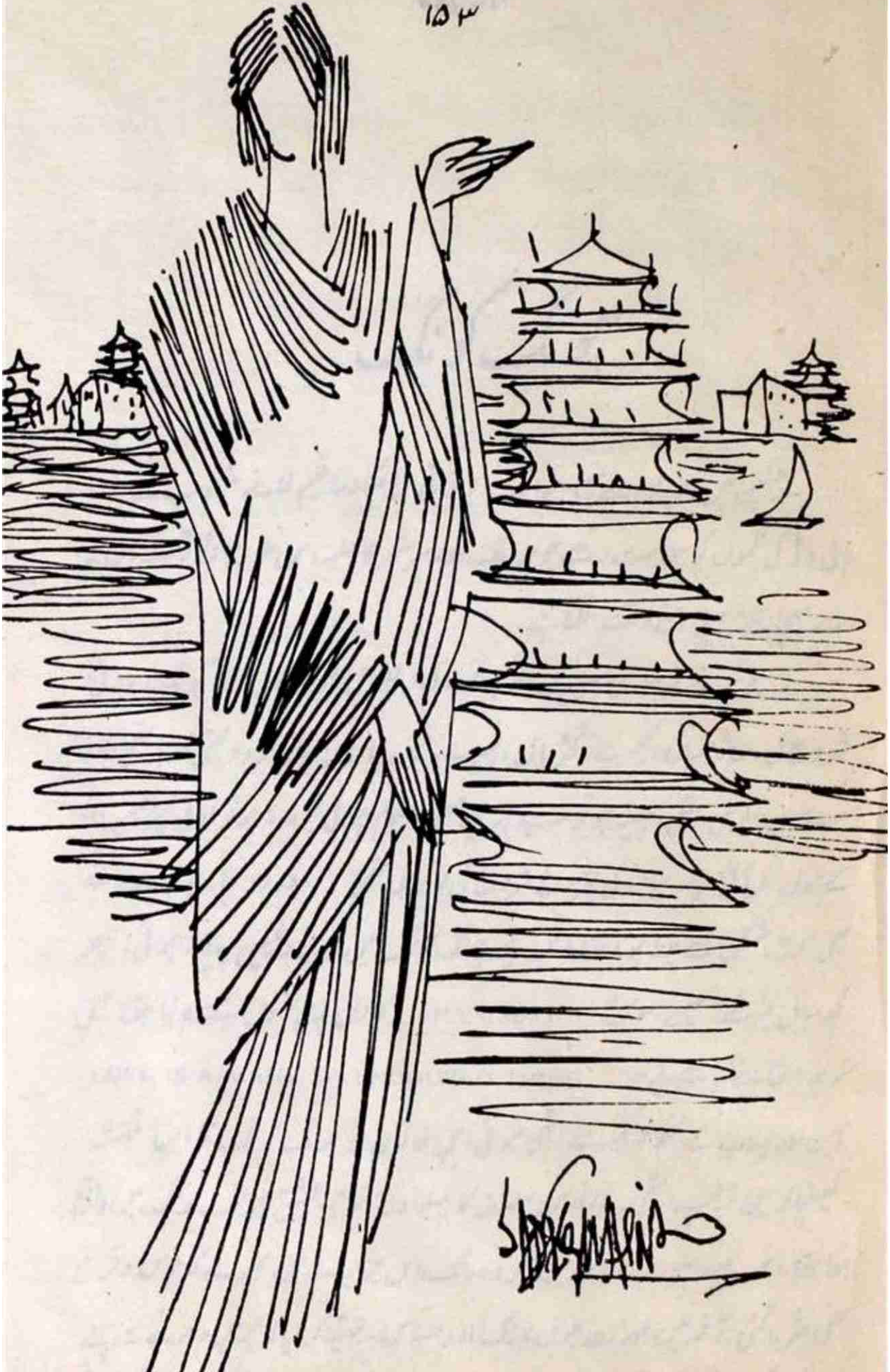
نے رابرٹ کینیڈی کو راستے سے ہٹایا۔ یوجین میکارتھی کو شکست دلوائی اور نکسن جیسے نوزٗ علیٰ نورصدر کو چنا۔ اس سیاسی نظام کو بدلنے کے لیے جب بھی کوشش ہوگی دبادی جائے گی۔ کیونکہ وہ دس فیصد امیر طبقہ جو صحافت اور سیاست کی اکثریت پر حاوی ہے خاصا رجعت پسند، تنگ دل اور کوتاہ نظر ہے۔ وہ ذراسی اصلاح سے ڈر جاتا ہے۔

پچھلی گرمیوں سے اب تک امریکہ کے ضمیر نے کروٹ لی تھی۔ ہمیں اس سے بہت امیدیں تھیں اور اب بھی خواہش رکھتے ہیں کہ خدا اس قوم میں ایسے رہبر پیدا کرے جن کو امریکی معاشرہ نہ صرف جینے دے بلکہ رہنمائی کرنے دے۔ جب کوئی چھوٹا ملک حماقتیں کرتا ہے تو ان کا اثر صرف اپنے تک محدود رہتا ہے۔ لیکن جب امریکہ جو بیشتر دنیا کی قسمتوں پر چھایا ہوا ہے۔ بے لگامی کے آثار ظاہر کرتا ہے تو خوف آتا ہے۔ کیونکہ اس کی کرتوتیں دوسرے ممالک پر بھی اثرانداز ہوتی ہیں۔

آخر میں چند باتیں امریکی عورت کے بارے میں لکھنا چاہتی ہوں۔ امریکی عورت کا دنیا میں جواب نہیں۔ نسلی اخلاط کے خمیر سے اٹھی ہوئی یہ عورت بہت حسین ہے صحت مند ہے اور ہرفن مولا ہے۔ اس کے گوناگوں مشاغل نے اسے اتنا دلچسپ اور بذلہ سنج ساتھی بنادیا ہے کہ مرد اس کی صحبت میں بہت محظوظ ہوتے ہیں اور دیکھا بھی ہے کہ گھر میں اسی کا راج ہوتا ہے۔ خاوند کی کم چلتی ہے۔ مردوں کو اس عورت کے خلاف شکایات ہیں کہ وہ بہک گئی ہے۔ امریکہ کی روائتی خانگی پاک دامنی پر بٹہ ہے۔ خاندانی امن پر سایہ ہے۔ تیرہ چودہ سال کی عمر ہی سے یہ جنسی آزادی چکھ لیتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ سب الزامات نہ صرف یورپی عورتوں پر عاید ہو سکتے ہیں۔ بلکہ ایشیائی ملکوں کی کئی عورتوں پر بھی۔ البتہ بوڑھی امریکن عورتوں کا طبقہ دنیا سے نرالا ہے۔ یہ طبقہ امریکہ کی کثیر دولت کا بڑا حصّہ دار ہے۔ کیونکہ یہ زیادہ تر بیوہ عورتوں پر مشتمل ہے۔ امریکی مرد جب کما کما کر تھک جاتا ہے تو چل بستا ہے۔ اور یہ نقرئی

زلفوں والی ساٹھ ستر سالہ امیر زادیاں دنیا کی سیر کو نکل کھڑی ہوتی ہیں. ہمارے ملک میں بڑی بی کو ڈھائی گز کو را لٹھا اور دو گز زمین سونپی جاتی ہے. امریکہ کی معمر خاتون کی نئی زندگی ساٹھ کے بعد سے شروع ہوتی ہے. بہر حال مجھے امریکی عورت سے متعصبانہ حد تک محبت ہے. کیونکہ یہ عورت سیماب کی طرح بے چین. زندگی سے بھرپور. علم اور خلوص سے سرشار اپنے دل میں ساری دنیا بلکہ سارے آفاق سے عشق رکھتی ہے.

عورت کی زبان جب چلتی ہے تو رُکتی نہیں. اس لیے اب میں ذرا خاموش ہو جاؤں تو بہتر ہے. امریکہ کا تجزیہ تو بڑے بڑے عالم ضخیم جلدوں میں کریں جب بھی مکمل نہ ہو مجھ غریب کی کیا بساط! یہ ملک خداداد قدرتی حسن اور سماجی امارت کا شعوری طور پہ مالک ہے. جس میں جتنی خوبیاں ہیں اتنی کمیاں. یہ امریکہ کیا ہے؟ ایک نیا ملک. ایک نئی قوم بلکہ قومیں جو ایک سیاسی نشان و آئین کے ارد گرد شعوری طور پر جمع کی گئی ہیں یہاں ایک معاشرتی کھچڑی ہے جو پک پک کر ابل رہی ہے. اس ملک کا رقبہ اتنا وسیع ہے کہ اگر سین فرانسسکو میں کوئی سانحہ ہو تو نیویارک میں کوئی خبر نہیں. کوئی تعلق و تجسس نہیں کیوں کہ ان دونوں میں اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا کہ لندن اور بغداد میں!



ہونگ کونگ

ہونگ کونگ

لڑکپن میں اس نام سے چینی طوائف. یرقانی جرائم اور افیم خانے منسوب تھے. خدا ہالی وڈ کی فلموں کو سلامت رکھے جو ہر ملک اور ہر شہر کا حلیہ اس طرح بگاڑتے ہیں کہ اسے پہچانتے پہچانتے دقت لگتا ہے.

بڑے ہونے تو ہماری سہیلیوں نے ہونگ کی (بقول بمبئی والوں کے) "بونگ مارنی" شروع کی. ساڑھیاں، کیمرے، گھڑیاں، ہیرے: لیکن ہماری مثال تو وہ تھی کہ ہاتھی ٹکاؤ سستا اور بکری مہنگی. پیسہ ہو تو سب چیزیں بھلی معلوم ہوتی ہیں. نہ ہو تو ادنیٰ چیز بھی باوا کے مول نظر آتی ہے. میاں کی شروع شروع کی نوکری تھی. دوا ور دو چار جوڑتے ہوئے بھی بجٹ مشکل سے پورا ہوتا تھا. اس لیے ہونگ کونگ میں کوئی دلچسپی پیدا نہ ہوئی. پھر کچھ سال ہوئے "حین سوین" HAN SUYIN کا دل پذیر ناول جسے دنیا جتنا بھی سر پہ اٹھائے کم ہے. پڑھا LOVE IS A MANY SPLENDOURED THING چین اور یورپ کے مخلوط خمیر سے اٹھی ہوئی اس خاتون نے ہونگ کونگ کا ایسا نقشہ کھینچا کہ میں تڑپ اٹھی. غالباً اس مصنفہ کا پہلا اور آخری عشق ہونگ کونگ میں واقع ہوا تھا. اس لیے انھوں نے وجد میں آکر وہ رنگ اس جزیرے میں بھرے کہ قوس قزح بھی شرما گئی. آخر میں عورت ہوں نازک اور حسّاس. تہیّہ کر لیا کہ جزیرہ مرنے سے پہلے ضرور دیکھوں گی. اس قسم کے ارادے میں نے متعدّد مرتبہ کیے. چونکہ موت وقتاً فوقتاً

ملتوی ہوتی رہی تھی۔ اس لیے اللہ کی بنائی خاصی دنیا دیکھ لی۔ میرے میاں کہتے ہیں کہ "تمہارا مرنا ابھی بہت دور نظر آتا ہے۔ اس لیے مرتے مرتے تم میری جیب خالی کر جاؤ گی"۔

میرے شوہر محترم ایک کانفرنس میں ٹوکیو جا رہے تھے۔ ہوائی جہاز میں دو گھنٹے باقی تھے۔ میرے دل میں جو سمائی تو پوچھا "چلوں"؟ فرمایا "چلو"۔

اس قدر مختصر اجازت، اس سرعت سے کسی بیوی کو ایک سی۔ ایس۔ پی سے کبھی نہیں ملی ہوگی۔ بہرحال دیوانگی سے زیادہ اپنے میاں کی ہمت اور فیاضی کی داد دیتی ہوں۔

تو لیجیے صاحب! اِدھر میں نے سوٹ کیس میں چار ساڑھیاں پھینکیں۔ اُدھر میاں نے ٹکٹ کے لیے سٹیٹ بنک سے اجازت لی۔ ہونگ کونگ کے لیے ویزا درکار نہیں ہوتا روپیہ مجھے نہیں چاہیے تھا۔ اس لیے سٹیٹ بنک کو پس و پیش کی کچھ گنجائش ہی نہ رہی۔

میرے میاں پر چودہ سال میں میری صرف ایک بات کا رعب پڑا ہے اور وہ ہے میری قناعت۔ میں ممالکِ غیر میں خرید و فروخت کا درندہ کبھی نہیں بنتی۔ دوسرے ممالک میں سیر و سیاحت کے مواقع اس قدر ہوتے ہیں کہ خریداری کے لیے وقت کم ہی بچتا ہے اور یہ اپنے شوق کی بھی بات ہے۔ شاید اس مسئلے میں مجھ میں نسوانیت بہت کم ہے۔

قصہ کوتاہ! دو گھنٹے کے اندر میں میاں کے ساتھ "بی۔ او۔ اے سی" کی آرام دہ کرسی پر دراز تھی اور نیچے زمین پر رہنے والے ٹاپتے ہی رہ گئے کہ یہ گئی کہاں؟

میرے والد کا فون آیا کہ "رسولن بائی کی محفلِ موسیقی جمنے والی ہے۔ اختر کا انتظار ہو رہا ہے۔ کہاں ہے"؟ نوکر بولا۔ "بیگم صاحبہ جاپان چلی گئیں"۔

جواب ملا۔ "کیا بکتے ہو ابھی تو وہ مجھ سے طنبورہ لانے کو کہہ رہی تھی"!

بہرحال جو صلواتیں مجھ پر پڑی ہوں گی۔ وہ میں ہی جانتی ہوں لیکن اس وقت تو ہونگ کونگ کے لیے میری روح پر تول رہی تھی اور مجھے کسی کی پرواہ نہیں تھی۔

تیسرے پہر ہمارا جہاز دو چار بادلوں کے جھرمٹ میں اترنا شروع ہوا۔ جزیرے کے جاذب خط و خال ابھرے۔ کہیں کہیں دھوپ کے دھبے، کہیں کہیں چھاؤں کی چھائیاں پرسکون پانی، نیا ہوائی اڈہ، عین دو پانیوں کے بیچ میں بنایا گیا ہے۔ جہاز اس طرح پانی کو چھوتا ہوا اترتا ہے کہ گویا آب دوز کشتی ہے۔ کم از کم اس کے پر تو ضرور چھینٹے اڑاتے ہوں گے۔ ہوائی اڈہ کشادہ۔ کسٹم افسران "سمگلروں" کے باوجود باتمیز اور پھرتیلے۔ ٹیکسی تیز اور سستی۔ مغربی ہوٹل مہنگے۔ چینی سرائے ٹکے سیر۔ بازار رات کے بارہ بجے تک کھلے ہوئے۔ سڑکوں پر ساری رات رونق، ایک جاندار اور جوشیلا شہر ہے ہونگ کونگ! آپ اس سے کبھی بیزار نہیں ہو سکتے۔

پچھلے برسوں میں، اتفاق سے مجھے، اسے تین دفعہ دیکھنے کا موقع ملا اور تینوں مرتبہ مجھے از سر نو لطف حاصل ہوا۔ حالانکہ نہ تو یہ کسی بڑے ملک کا دارالسلطنت ہے نہ اس کا کوئی تاریخی پس منظر ہے۔ یہ شہر روایات سے مبرا، قدامت سے محروم ہے۔ اس گنجان بستی میں ایک بھی عجائب گھر نہیں اور ہو بھی کیسے؟ اس جزیرے کو سمندری لٹیروں کی بستی کہتے تھے۔ پھر برطانیہ نے کوڑیوں کے مول اسے چین سے خرید لیا۔ جنگ عظیم میں جاپانیوں نے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن پھر پیلی چمڑی کو یہاں سے مراجعت کرنی پڑی اور برطانوی پرچم دوبارہ بلند ہو گیا۔ تو یہ ہے ہونگ کونگ کی تاریخ۔ اس تاریخی یتیمی کے باوجود ہونگ کونگ موجودہ بین الاقوامی سیاست اور سرخ چین کی روز افزوں طاقت کی وجہ سے دنیا کے نقشے پر یہ ایک اہم نقطہ بن گیا ہے۔

تین دفعہ قیام کے بعد میری ذاتی رائے یہ قائم ہوئی کہ ہونگ کونگ میں پانچ قسم کے باشندے پائے جاتے ہیں۔

۱۔ سیاح، "یہ قوم" سردی گرمی سرگرداں رہتی ہے اور باقی آبادی پر اتنی چھائی ہوئی ہے کہ اصل باشندے بعض اوقات نظر نہیں آتے۔ گردن میں کیمرے، تین قسم کے، کلائی

پر گھڑیاں دکم سے کم دو، ناک تک ہاتھ میں بنڈل دکم سے کم دس)اس قوم کو اگر جہاز بدلنے میں دو گھنٹے کا بھی وقفہ ملتا ہے تو فوراً بازار کا رخ کرتی ہے۔ اس میں ستر فیصد عورتیں ہوں گی جو چمگادڑوں کی طرح دکانوں پر منڈلاتی رہتی ہیں۔ سیاحوں کی اس قوم نے ہونگ کونگ کے دام کہاں سے کہاں تک پہنچا دیئے ہیں۔ یہ جزیرہ کبھی سستا ہو گا لیکن اب نہیں۔ نام بڑے اور درشن تھوڑے۔ میکانکی اشیا رجرمنی میں سستی، ریشمی کپڑے اور نائلون اور مصنوعی زیورات امریکہ میں زیادہ سستے اور اونی ملبوسات انگلستان میں۔

خریداری کے معاملے میں ہونگ کونگ ایک ڈھونگ ہو گیا ہے اور معصوم سیاح اس خوش فہمی میں ہزاروں روپے لٹاتے جاتے ہیں کہ شاید کسی دوسری جگہ یہ چیزیں اتنے داموں میں نہ ملیں۔ اس کی صرف ایک چیز اب بھی سستی ہے اور ہمیشہ سستی رہے گی اور وہ ہے کشیدہ کاری، ہر سوتی اور ریشمی کپڑے پر۔ بھلا ہو برائے نام مزدوریوں کا جن پر غریب چینی عورتیں دیدہ ریزیاں کر کے زندہ ہیں۔

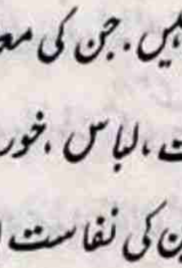
۲۔ دوسری قسم ماہِ عسل منانے والوں کی ہے۔ شادی چاہے برازیل میں ہو یا برلن میں: دولہا دلہن " ہنی مون" کے لیے ہونگ کونگ ضرور جاتے ہیں۔ یہ دنیا سے بے خبر ایک دوسرے کے بازوؤں میں لپٹے ہوئے وقت کی دھار میں بہتے جاتے ہیں۔ اگر صرف ایک دوسرے کی شکل ہی سارے وقت دیکھنی تھی تو یہ جوڑے اتنی دور کیوں آتے ہیں؟ چونکہ مرد ایک رومانوی جانور ہے۔ اس لیے اپنی منکوحہ حماقت کے لیے رومان انگیز پس منظر تلاش کرتا ہے۔

یہ قوم دور سے پہچانی جاتی ہے۔ کیونکہ دولہا کی چال میں نشہ ہوتا ہے اور دلہن کی آنکھوں میں ستارے جھلملا رہے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ قوم بھاؤ بھی نہیں چکاتی۔ جو کوئی جہاں کہیں جو کچھ مانگے دے دیتی ہے۔

۳۔ تیسری نوع بیرونی اخبارات کے نامہ نگاروں کی ہے۔ خاص طور پر امریکی صحافی

اور سیاسی "آبزرور" OBSERVER یہ آبادی سب سے اہم اور خطرناک ہے وجہ یہ ہے کہ ان کی گنتی اتنی ہی لا محدود ہے جتنی کہ ان کی کوتاہ علمی، یہ نامہ نگار ہزاروں کی تنخواہوں پر بیٹھے ایک حسین جزیرے میں پل رہے ہیں اور اپنی ننھی دوربینوں سے چین کی دیو زاد وسعتوں کا جھوٹا سچا جائزہ لے لے کر اپنے ہیڈ کوارٹر میں رپورٹیں بھیجتے رہتے ہیں۔ ان میں سے اکثریت نے کبھی چین کی سرزمین پر قدم نہیں رکھا ہے۔ کچھ اِدھر سے سُنا کچھ اُدھر سے ٹٹولا اور ایک تبصرہ گھسیٹ دیا۔ یہی قوم جاسوسی کی خدمات بھی انجام دیتی ہے اور شام کو کلبوں میں ایک دوسرے کے جام صحت بھی پیتی ہے۔ پندرہ سال سے مشرق و مغرب کے دانشور اسی گروہ کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ ان کے متعلق لطیفے گھڑ رہے ہیں۔ جملہ بازیاں کر رہے ہیں۔ لیکن ان کے کان پہ جوں نہیں رینگتی۔ امریکہ نے اگر ان صحافیوں کی فوج یہاں نہ رکھی ہوتی اور ہزاروں دفتر ریسیرچ کے نہ کھولے ہوتے تو شاید مشرق بعید اور خصوصاً چین پر زیادہ صائب نظر پیدا کر سکتا۔

۴۔ چوتھی قسم اصل نسل باشندے ہیں۔ جن کی معاشرت کی سات پیڑھیاں جنوبی چین سے ملتی ہیں۔ ان کے خط و خال، رنگت، لباس، خورد و نوش۔ لہجہ و زبان خالص کینٹونی CANTONESE ہے۔ شمالی چین کی نفاست اور شیرینی مفقود ہے۔ اگر اس قوم کو گھنٹہ بھر صرف "کینٹنیز" بولتے ہوئے سُنیں تو منہ بسورنے لگیں اور پندرہ منٹ اور سُنیں تو بلک بلک کر رو دیں۔ اس زبان کا اتار چڑھاؤ دُنیا سے نرالا اور ایسا رقت آمیز ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ اگر اس لہجے کا میں تحریدی نقشہ کھینچوں تو یہ ہوگا۔



اس فصیح و بلیغ لہجوی نقشے سے ظاہر ہو گیا ہوگا کہ اس زبان کی کھرج اور ٹیپ کہاں تک ہیں۔ ہر جملے پہ آواز ڈھئی جاتی ہے اور میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔

بہر حال یہ چینی قوم اصل سرخ چین کا بنا سپتی نمونہ ہے اور سوائے محنت و مشقت کے جو ہر چینی کے خون میں رچی ہوئی ہے۔ اس قوم میں ہر وہ خامی نظر آتی ہے جسے سرخ چینی "بورژوا" تصور کرتے ہیں۔ ہمہ اوقات ذاتی کاروبار۔ ذاتی مفاد، ذاتی مکاریاں، ذاتیات کی بدترین مثال !!

۵۔ اس شہر کی آبادی کی پانچویں قسم طوائفیں ہیں۔ جن کو انگریزی میں بھینے بھینے ناموں سے پکارا جاتا ہے مثلاً "دیمی مونڈ" "ٹرک کی دوسری طرف کی عورت" "سرخ علاقے والی عورت" وغیرہ وغیرہ۔

اس موضوع پر مجھے اتنا ہی معلوم ہے جتنا مجھے تینوں بار وہاں بتایا گیا۔ پہلی دفعہ جب میں ہفتہ بھر ٹھیری تو ہونگ کونگ میں ہمارے دوست جو ایک ملک کے سفیر تھے بہت دلچسپ رہبر بنے۔ وہ طوائفوں پر خاصی ریسرچ کر چکے تھے۔ واللہ اعلم یہ ریسرچ ذاتی تھی یا اکتسابی!

بہر حال اندازہ یہی ہوا کہ ہر ملک کی طوائف قانون سے بچنے کے لیے نئے نئے سوانگ بھرتی ہے۔ جاپان میں "گیشا" بنتی ہے۔ لندن میں "ٹیکسی سوار"۔ نیویارک میں "کول گرل" سویڈن میں "ساؤنا" کی حمام دان۔ پاکستان و ہندوستان میں ایکٹرس۔ یورپ میں شبینہ کلب میں رقص اور مشروب کی ساتھی۔ ہونگ کونگ میں طوائفوں نے مالش کرنی سیکھ لی ہے ہر نو آمد مرد کو آتے ہی ان مالشنوں کی فہرست دے دی جاتی ہے۔

"رچرڈ میسن" نے THE WORLD OF SUZIE WONG لکھ کر اس طوائف کو اور اس کے قدیم پیشے کو اور ڈرامائی بنا دیا ہے۔ یہ افسانوی "سوزی وونگ" اب ایک اصلیت بن گئی ہے۔ سنا ہے ہونگ کونگ کے "لک کوک" ہوٹل پر حسن برستا ہے لوگ اس عقیدت سے دیکھنے آتے ہیں۔ گویا "سوزی" ابھی باہر آ جائے گی اور ان سے ہاتھ ملا کر شراب پینے بیٹھ جائے گی۔

بعض شہر تو ایک معمر طوائف کی طرح رات کی چکا چوند میں نبھ جاتے ہیں۔ لیکن صبح اگر ان کی مستی سرمہ اترنے کے بعد شکل دیکھو تو کراہت آئے گی۔ ہونگ کونگ ان نادر جزائر میں سے ہے جو دن کے وقت بھی خوش نما معلوم ہوتے ہیں اور رات کو ان کا حُسن اور بھی نکھر آتا ہے۔ پاکستان کی طرح اس شہر کے دو اہم ٹکڑے ہیں جو ایک دوسرے سے خاصی دور ہیں۔ ایک کو ہونگ کونگ کہتے ہیں۔ دوسرے کو "کاؤلون" لیکن چونکہ دونوں کے درمیان پانی ہے۔ اس لیے ہر دس منٹ کے بعد ایک کشتی چلتی ہے۔ جس کا کرایہ واجبی سا ہے۔ اس "فیرا سٹیشن" پر ہر دس منٹ میں انسانوں کا سیلاب اُمڈتا ہے۔ اور اس کی دو منزلوں میں سما جاتا ہے۔ پندرہ منٹ میں یہ کشادہ "فیری" ایک بستی سے دوسری بستی میں پہنچا دیتی ہے۔ دونوں بستیوں میں خاصا فرق ہے۔ ہونگ کونگ کا سماجی درجہ اونچا ہے۔ وہاں پرانے رئیس، نو دولتیا لکھ پتی۔ انگریزی سرکار کے بلند اہلکار اپنی خود پسندی اور خود ستائی میں بری طرح مست ہیں۔

دوسری طرف کاؤلون مقابلتاً سستا ہے۔ چھوٹی چھوٹی گلیوں میں ننھی ننھی دکانیں بھی ہیں۔ سودا چکانے کا بہت مزہ آتا ہے۔ مجھے تو وہ پرانے دن یاد آ گئے جب سائیکل پر "چن چن چائنا مین" بوسکی اور کشیدہ کے کپڑے لاد کر بیچتا پھرتا تھا اور بچے پیچھے پیچھے تالیاں بجاتے تھے۔ ان سائیکل سوار سوداگروں سے سودا چکانے کا بڑا لطف آتا تھا۔ وہ زمانہ تھا فرصت کا۔ ماں بہنیں ابھی نوکری کے چکر میں نہیں پڑی تھیں۔ ان کے پاس وقت کی افراط تھی۔ اس لیے "چائنا مین" سے کاروبار بھی ایک پکنک ہوتی تھی۔ چاہے دو گھنٹے کی بحث کے بعد ایک رومال یا ایک میز پوش ہی خریدیں۔ لیکن تفریح رہتی تھی اور چائنا مین کو بھی جلدی نہیں ہوتی تھی۔ وہ کم بخت بیس روپے گز سے قیمت شروع کر کے تین روپے گز پہ سلک دے کر جاتا تھا اور بیس روپے سے تین روپے پر آنا بھی ایک آرٹ ہوتا تھا۔ بہر حال "کاؤلون" میں اگر آپ تھوڑی سی بہت

زبان جانتے ہیں تو قیمتیں خاصی کم کروا سکتے ہیں، اور زبان نہ بھی جانیں تو ہاتھ کے اشاروں سے سمجھا سکتے ہیں۔ دکانداری میں چینی قوم کو کوئی نہیں ہرا سکتا وہ سو روپے پر صرف دو پیسے نفع رکھتا ہے۔ لیکن بکری کی کثرت پر ہزاروں کما لیتا ہے۔ مسلمان بھائی نہیں کہ پہلے ہی داؤ میں صد فی صد کما لیا اور پھر سارا سال ڈنڈے بجائے۔

کاؤلون میں ایک مشہور سڑک ہے NATHAN ROAD جس کا جواب دنیا میں نہیں ہے۔ نیویارک کا "ٹائمز سکوئر" پیرس کا "شانزا لیزے" روم کی "دیا وینیتو" اور لندن کی "پیکا ڈلی" اس سڑک کے سامنے بالکل ہیچ معلوم ہوتی ہیں۔ اس شاہراہ کے جادو کا راز یہ ہے کہ دونوں طرف شانہ بشانہ چینی رسم الخط میں دکانوں کے نام یا اشتہار ہیں، جو مخصوص رنگوں سے آراستہ ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں کالے لال اور سنہری رنگ سے اشتہاری جلوؤں میں یکسانیت کے ساتھ کرختگی آگئی ہے۔ ہونگ کونگ کے برقی قمقمے ہلکے گلابی، کاسنی اور فیروزی!! ان کی آمیزش میں ایک لاجواب دلنوازی ہے "نیون" کی گوناگوں اشتہار بازی کو دنیا میں عام ہے لیکن چینی رسم الخط کی برکت سے ایک یہی اشتہار کسی چینی چترکار کا طغرہ معلوم ہوتا ہے۔ اتنی روشن اور اتنی سحر آگیں سڑک میں نے اور کہیں نہیں دیکھی۔ اس کو اگر مکمل زاویئے دیکھنا ہو تو ڈبل ڈیکر بس میں اوپر بیٹھ کر دیکھئے۔ یہ سڑک کسی وقت نہیں سوتی۔

ہمارے رہنما اور میزبان ایک پنجابی ڈاکٹر اور ان کی بہن تھی۔ یہ دونوں تحصیل چکوال کے ہیں اور عرصے سے یہاں پر بسے ہوئے ہیں۔ پنجابی چینی تلفظ سے اور چینی چکوالی تلفظ سے بھو نکتے ہیں۔

پنجابی جواں مرد بھی خوب ہے۔ اتنا سیلانی، محنتی اور قسمت آزما کہ دنیا کے ہر کونے میں پایا جاتا ہے۔ اسے میں نے "لیک ڈسٹرکٹ" میں چوڑیاں بیچتے دیکھا۔ اسے میں نے "ڈین کوور" میں لکڑی کا ٹال لگائے دیکھا۔ یہ ہوائی میں ہوٹل چلا رہا ہے اور تبت میں قصابی کر رہا ہے۔

تو خیر ہمیں ہونگ کونگ بہت بھایا ہر وقت گہما گہمی، یہ شہر شاید ہی رات کو کبھی پلک جھپکاتا ہو. کیونکہ سیاحوں نے اس کو لاڈ میں اس قدر "بھٹایا" ہے (ہمارے چکوالی میزبان کا جملہ) کہ یہ شہر ہر وقت ان کے لیے وا ہے. ہر جگہ دکانداری چل رہی ہے. ہوٹل کے کمرے میں، ریلوے سٹیشن میں، تار گھر میں، ہسپتال میں، غرض جدھر جاؤ، اشیا رہی تھی ہوئی ہیں. سامان کی اتنی افراط ہے کہ دکانوں پر سے ابل ابل کر سڑکوں پر آپڑتا ہے. جدھر نظر جاتی ہے. ہاتھی دانت، کانچ، آبنوس سیپ، لاکھ، مینا سیم وزر، ریشم واطلس کی صنعت کاریاں. کوئی کیا دیکھے کیا خریدے!!!

عورتیں چیلوں کی طرح جھپٹ رہی تھیں. اون کے سویٹر، ہزار ز یا مشتوں یعنی نگ و موتیوں سے آراستہ، نائٹ سوٹ "کمونو" کمخوابی سٹین کے نائٹ گاؤن، جوتیاں، بٹوے چھتریاں. ریڈیوگرام سے لے کر مچھلی کے انڈے تک اور فرنیچر سے لے کر بندر کے دماغ تک کیا نہیں ملتا؟ چین سے اڑائے سوئے خزانے یہاں، جاپان کی صنعتوں کے گودام یہاں، برطانیہ اور جرمنی کی منڈیاں یہاں ___ لیکن اپنے اوسان قائم اور بٹوہ سنبھال کر جیب میں رکھیے ورنہ یہاں دونوں کے غائب ہونے کا اندیشہ ہے. اس خرید و فروخت کی فردوس میں کئی معصوموں کی حجامت بنی. ہم خود دکانداروں کے ہاتھوں الّو بن گئے ہمیں ایک ریڈیوگرام دکھایا مگر روانہ دوسرا کر دیا.

البتہ ہونگ کونگ میں ایک ضخیم دکان ہے جسے "سرخ چین کا امپوریم" کہتے ہیں. جہاں آپ آنکھ بند کر کے چیزیں خرید سکتے ہیں اور کوڑی کی بے ایمانی نہیں ہوگی یہ دکان ہونگ کونگ تو کجا سارے ایشیا میں سب سے سستی ہے. چین سب پر ثابت کر رہا ہے کہ وہ نہ صرف ہر شے بنا رہا ہے بلکہ سب سے اچھی اور سب سے سستی بھی. اس دکان کی ہر منزل پر گھنٹوں لگ جاتے ہیں. بس مجھے تو وہ ایک عجائب گھر یا نوادر خانہ معلوم ہوا ۔ کاریگری اور دیدہ ریزی کی انتہا تھی. میں مزے سے اندر ٹہل رہی تھی اور باہر امریکن عورتوں

کی حسرت بھری نگاہوں کو دیکھ رہی تھی، جو اس کی نمائشی کھڑکیوں سے چپکی ہوئی تھیں۔ سیاسی تعصب اور کور بینی کی انتہا ہے کہ امریکہ والوں نے اپنے باشندوں کو اس دکان سے کچھ خریدنا ممنوع قرار دیا ہے۔ اگر اس دکان کا ٹھپہ کسی شے پر نظر آ جائے تو امریکی کسٹم والے وہ چیز ہی ضبط کر لیتے ہیں۔ لیکن عورت ایک عورت پہلے ہوتی ہے اور وطن پرست بعد میں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکن عورت چپکے چپکے چیزیں خریدتی ہے اور اس پر سے سرخ چین کے لیبل پھاڑتی جاتی ہے

سیاحت دو قسم کی ہوتی ہے۔ انفرادی اور دوسری مجموعی۔ ذاتی سیاحت میں خود دھکے کھاتے پھریئے۔ ٹیکسیاں لیجئے۔ گائیڈ بک پڑھئے۔ اس میں آزادی زیادہ اور آرام کم ہے مجموعی۔ سیاحت میں اپنے تئیں کسی ٹورسٹ دفتر کے سپرد کر دیجئے۔ وہ آپ کو تین گھنٹے میں آدھا شہر دکھا لائے گا اور پیسے کرارے لے گا۔ اپنی اپنی ذہنیت، مزاج اور بٹوے کی وسعت پر منحصر ہے کہ آپ کون سی سیاحت اختیار کریں۔ پہلی دفعہ تو میں نے دفتری سیاحت کی۔ جزیرے کے چاروں طرف گھومی۔ واقعی اس کے ساحل امن آفریں اور خاموش ہیں مچھلی پکڑنے والے۔ تیراکی کے شیدائی، کشتی رانی کے سودائی سب مگن ہیں۔ سیر کرتے کرتے ہم "ٹائیگر بام گارڈن" پہنچے۔ یہ ایک چینی لکھ پتی نے اپنے شوق کے لیے بنوایا تھا۔ لیکن جب ٹائیگر بام سے آمدنی زیادہ ہو گئی تو اس نے اس باغ کو عوام کے لیے کھول دیا۔ اور نام بھی اسی پر رکھا۔ یہ ایک بھونڈے یا بھیانک دماغ کی ایجاد ہے۔ چاروں طرف اونچی پہاڑیوں کو کاٹ کاٹ کر تاریخی مناظر اور تاریخی لمحے تراشے گئے ہیں۔ کہیں جون آف آرک کو جلایا جا رہا ہے۔ کہیں افریقہ میں بھوت اتارا جا رہا ہے۔ کہیں فرنگی سولہ ہیٹ پہنے چینیوں کو غلاموں کے بازار سے خرید رہا ہے۔ غرضیکہ اوندھے سیدھے مجسمے اور مناظر جنہیں آدھا دیکھ کر ہی سانس پھول جاتا ہے۔ اور دل بھر جاتا ہے۔ اسے OPEN AIR CHAMBER OF HORROR کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

تو عمر بہت خوش ہوتے ہیں کہ ہر چڑھائی کے بعد آئس کریم اور نا ہنجار کوک بکتی ہے۔
ہم تو اس بات سے متاثر ہوئے کہ چینی سا ہو کار ہے کما کر واپس پبلک کو کچھ دے تو دیا۔ ہمارے
یہاں تو سوداگر صرف کمانا جانتے ہیں۔ دینا نہیں۔

قصہ کوتاہ ایک اور جگہ لایا گیا۔ جس کے ارد گرد سیاح طواف کرتے ہیں اور وہ ننھا سمندری
غذا کا SEA FOOD ریستوران۔ مجھے ذاتی طور پر سمندری مخلوقات سے کوئی
رغبت نہیں سوائے مچھلی کے میں نے کبھی کوئی اور آبی پیداوار نہیں کھائی۔ لیکن اس ریستوران
میں لوگوں کو نہ صرف جاندار تھرکتی مچھلیاں کھاتے دیکھا۔ بلکہ کچھوے کا سوپ اور خوفناک
شارک کے پروازی بازو کا مرکب بھی بکتے دیکھا۔ ہر قسم کے کچھوے۔ مینڈک۔ جھینگے، کیکڑے
رنگا رنگ کی سلاد میں سجے ہوئے دیکھے۔ انسان بھی کیا جانور ہے ہر چیز کھانے کو تیار ہے
جب کچھ اور نہ ملے تو ایک دوسرے کو کھاتا ہے۔ اور بہت مہذب ہو تو اپنے آپ کو کھانے
لگتا ہے۔

ہونگ کونگ کے دو رُخ ہیں۔ ایک طرف بلند کاخ زریں اور عظیم بارگاہیں اور
دوسری طرف غریب مہاجروں کی اداس بستیاں۔ یہ مہاجر کچھ ازلی ہیں اور غالباً چین واپس
چلے جائیں گے۔ ایک پورا دن میں ان کی نوآبادیوں میں پھری جو حکومت اور عیسائی تبلیغی
مشن قائم کر رہے ہیں۔ گو خدمت سرعت سے ہو رہی ہے لیکن جو مچھیروں کے گاؤں ——
ABERDEEN FLOATING-VILLAGES کشتیوں میں آباد ہیں۔ ان کے لیے
ناک دور سے بند کرنی پڑتی ہے۔ ایک دو گز پانی کی ناؤ میں ایک انسان کس طرح اپنی زیست
کا تقاضا پورا کرتا ہو گا۔ وہاں دیکھنا چاہیئے۔ ہر غلیظ بادبان تلے انسان بمعہ اپنی "نوآبادیات"
جو اوسطاً چار حشرات الارض پر مشتمل ہیں۔ گود سے گور تک کی قید کاٹ رہا ہے
بعض علاقوں میں ان مہاجرین کے لیے مشترکہ گھر بنا دیئے گئے ہیں۔ یہاں مشترکہ باورچی خانے
مشترکہ غسل خانے، مشترکہ تفریح گاہیں اور مشترکہ کارخانے ہیں۔ اگر یہ کم نصیب مہاجر سرخ چین

کی اشتراکیت سے گھبرا کر یہاں آئے تھے تو کیا یہ نئے آسمان تلے وہی اشتراکیت نہیں! آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ غریب انسان کہاں بھاگے؟

ہونگ کونگ ایک اور چیز کے لیے مشہور ہے، اور وہ ہیں مشرقِ بعید کے طعام خانے۔ یہاں آپ برمی، انڈونیشین، جاپانی، کورین ہر قسم کے کھانے کھا سکتے ہیں۔ چینی ریستوران تو خیر ہر وقت بھرے رہتے ہیں۔ مجھے چینی دسترخوان سے خاص اُنس ہے اور کچھ بُرا بھلا پکا بھی لیتی ہوں۔ میں نے چینی غذا یورپ میں کھائی۔ امریکہ میں کھائی۔ جاپان میں کھائی۔ ہونگ کونگ میں کھائی اور بمبئی، کراچی و لاہور میں اکثر کھائی۔ اپنے دیس کے چینی کھانے میں مزہ تو ہے۔ لیکن خلوص نہیں۔ اصلی چینی کھانے سے اس غریب کا دور کا بھی رشتہ نہیں جڑتا اگر چین جانا نصیب نہ ہو تو کم از کم چینی سفیر کے گھر ضرور" اپنے آپ کو مدعو" کرائیے جو یہاں چینی چاؤ اور چٹخارہ دیکھا۔ چین سے باہر کہیں نہیں ملا۔ لکھتے لکھتے صرف یاد ہی سے منہ میں پانی آرہا ہے۔ اٹھارہ کورس کا ڈنر جس کے "ابتدائیہ" یعنی HORS D'OEUVRES ہی سے پیٹ بھر جائے۔ مثلاً اس ابتدائیہ میں سموکڈ مرغی اچار کی طرح ڈلی ہوئی چار اِنچی مچھلی۔ سرکے میں نرم کیا ہوا کھیرا اور بانس کی کونپلیں۔

پھر پردہ اٹھا تو اصلی ڈرامہ شروع ہوا "چکن چکی" نہایت لذیذ ہمارے بریانی کی جگہ ان کی "مشروم میاں" جو کھمبوں اور چاولوں کو سبزی کے قدرتی رنگوں کی تہوں میں دم دی ہوئی۔

پھر ایک ڈش آئی جو طعامی کارڈ پر FROG LEGS، بتائی گئی تھی۔ پیٹ میں ننھی سی اُبکائی اُٹھی۔ لیکن چینی سفیر ہنس دیئے۔ "ارے ڈریئے مت، یہ آپ کے لیے مینڈکوں کا بدرقہ اختراع کیا گیا ہے"۔ پالک کے پتّے کو بالکل مینڈک کی شکل کا تراش کر اس میں پسا ہوا مرغی کا قوام بھرا ہوا تھا۔ اس میں صرف جدت ہی نہیں لذّت بھی تھی۔

آخر میں سوپ آیا تو میرا سانس الٹا چل رہا تھا۔ کہیں گنجائش نہیں تھی۔ عجیب

بات کہ ہم لوگ اتنی چینی کھاتے ہیں لیکن خود "چینی" چینی نہیں کھاتے۔ نیم شیریں پانی میں کنول کے بیج سامنے رکھ دیئے کہ کھاؤ۔ چینی اپنی قدامت پسندی کو خورد نوش میں بھی لے آئے ہیں۔ ۲۵ سال پرانا انڈا جو سیاہ ہو چکا تھا۔ وہ کھلایا۔ سالہا سال پرانی لیچی جن کے اندر پھپھوندی بھنبھنا رہی تھی بہت شوق سے کھائی۔ اتنی پھپھوندی کھا کھا کر غالباً اس قوم کو پنسلین کی ضرورت نہیں رہی۔

ایک نوع قابل ذکر ہے۔ وہ ہے بدھ کا کھانا۔ اس نوع کے رستوران ڈھونڈ کر نکالنے پڑتے ہیں۔ لیکن جب آپ ایک دفعہ براجمان ہو گئے تو پھر بسم اللہ کیجئے اور کھاتے جائیے پلیٹیں کی پلیٹیں خالی ہوتی جائیں گی۔ لیکن آپ کا پیٹ بدستور خالی ہو گا۔ ڈریئے مت اس کا بل دیتے وقت آپ کے بٹوے کو ہرگز شرمندہ ہونا نہیں پڑے گا۔ بدھ کھانا ہونگ کونگ میں سب سے سستا اور خوش ذائقہ ہے۔ یہ چینی کھانے سے بھی ہلکا رہتا ہے اور بہت زود ہضم ہے جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں گوشت کسی قسم کا نہیں پکتا۔ بدھ لوگ عموماً نباتات خور ہیں۔ کوئی ہریاول نہیں چھوڑتے۔ کچے بانس کی جڑیں۔ کنول کے پھول، کنول کے بیج۔ اس کے علاوہ ہر طرح کی دال سے دس قسم کے طعام تیار کرتے ہیں۔ دال ہمارے یہاں غریبوں کا سہارا ہے۔ لیکن وہاں پر صرف چنے کی دال سے چھ نمکین ڈش اور چھ قسم کی مٹھائیاں تیار کرتے ہیں۔ اور وہ اس قدر ہلکی پھلکی کہ منہ میں ڈالو تو نگل جائیں بدھ مذہب جتنا خود بے لذت ہے۔ اتنے ہی اس کے کھانے لذیذ ہیں۔ آخر میں میں یہ کہوں گی کہ میری باتوں میں نہ آئیے گا۔ اس جزیرے کو خود جا کر قائل کیجئے یا قائل ہو جائیے ؏

ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

مشرقی ایشیا میں فرنگی شہنشاہیت کا آخری سنگ میل! تعیّشی اجارہ داری کا آخری قلعہ! ہونگ کونگ! بلاشبہ دنیا کے تھرکتے اور تھرتھراتے شہروں میں سے ہے۔ اس کا گالف کورس مشرق میں سب سے نفیس، اس کا ہسپتال "کوئین الزبتھ" مشرق

میں سب سے بڑا۔ اس کا ریس کورس دنیا میں سب سے زیادہ مہنگا اور بڑا، جہاں کا قدِ آدم ٹیلی ویژن الف سے یے تک "گھڑ دوڑ" دکھاتا ہے۔ پھر ہر منزل پر خود کار زینے۔

اس کی آبادی تیس لاکھ ہے۔ (سارے نیوزی لینڈ سے دس لاکھ زیادہ) یہ حقیقت کہ ستر کروڑ چینی صرف چند میل دور سرخ سرحد کے پار رہتے ہیں۔ اس شہر کی زندگی میں ایک نیا ولولہ پیدا کرتی ہے۔ ہراس نہیں۔ برطانیہ نے جس پٹے پر اسے چین سے خریدا تھا اس کے بقیہ ۳۵ سال رہ گئے ہیں۔ اگر چین چاہے تو بغیر انگلی ہلائے، اسے ایک ہی سانس میں ہڑپ کر سکتا ہے۔ لیکن اسے کوئی جلدی نہیں۔ جب بغیر کسی دردسری کے کروڑوں پاؤنڈ کا زرِ مبادلہ چین کو اس کے ذریعے پہنچ رہا ہے تو کیا مضائقہ۔

مشرقِ بعید میں برطانوی سامراج کا آخری علمبردار ہے۔ کب تک اس پرچم کو لہرائے گا۔ اس کا جواب صرف موجودہ کرۂ ارض کے دو یاجوج ماجوج روس اور امریکہ دے سکتے ہیں۔ جن کے ہاتھوں میں کم سے کم اگلے دس سال تک ممالک کی قسمتوں کی باگ ڈور ہے۔